اُردو نثر کی داستان

قسط ۔ ۱۱

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے منتخب خطوط، جنگ آزادی کے بارے میں اُن کا رویّہ، اُن کی فارسی اور اُردو نثر کا انتخاب، تقریظیں، دیباچے اور اُن کے عہد کی مکمل تصویر۔

مؤلف:
اے حمید

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور
روشن کتابیں

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی ایک
خصوصی پیشکش

اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۱

غالب کے منتخب خطوط، جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کا
رویّہ، اُن کی فارسی اور اُردو نثر کا انتخاب، تقریظیں اور دیباچے

مؤلف

اے حمید

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیر مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - عینکاف خالد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
اُدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور
فون نمبر :
۵۴۹۸۸ ۹۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

غالب کے خطوط

اُردو نثر کی داستان کی زیرِ نظر قسط میں مرزا اسد اللہ خان غالب کے منتخب خطوط، جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کا رویہ، اُن کی فارسی اور اُردو نثر کا انتخاب، تقریظیں، دیباچے اور اُن کے عہد کی مکمل تصویر پیش کی جا رہی ہے۔ غالب کے خطوط کے سلسلے میں مؤلف نے کتاب کے آغاز ہی میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ۱۸۵۰ء تک غالب فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے رہے اور اس کے بعد جب وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور 'مہرِ نیم روز' پر کام شروع کیا تو اس عرصہ میں اُنھیں ضرورت کے تحت اُردو میں خط و کتابت کرنا پڑی۔

مرزا غالب کی اُردو خط و کتابت کا انداز سب سے جُدا اور منفرد ہے۔ غالب سے پہلے اُردو خط و کتابت میں کسی نے بھی ایسا رنگ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اُن کے بعد کوئی اس کی پُوری نقل یا تقلید کر سکا ہے۔ اُنھوں نے اپنے مدعا کو بیان کرنے کا ایسا دل نشیں طریق اختیار کیا جیسے دو شخص آپس میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں۔

غالب کے خطوط پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد مؤلف نے جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کے رویّے کا جائزہ لیا ہے اور اِس کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی فارسی شاعری پر بھی عمومی نظر ڈالی ہے۔

قارئین ! اِس وقت آپ 'اُردو نثر کی داستان' کی قسط ۱۱ کا مطالعہ کریں گے۔ ہم آپ کو یاد دِلا دیں کہ یہ قسط وار اَدبی سلسلہ پندرہ اقساط میں مکمل ہو جائے گا اور یوں ہمارا آپ سے کیا ہُوا وہ وعدہ پُورا ہو جائے گا جو ہم نے اِس اَدبی سلسلے کے آغاز میں آپ سے کیا تھا۔ اُردو اَدب کے طلبا کے لیے یہ اَدبی دستاویز گنجِ گراں مایہ سے کم نہیں۔

'اُردو نثر کی داستان' کے ہمراہ آج ہم ایک اہم کتاب آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں امریکہ کے جاسوسی ادارے 'سی آئی اے' کے بارے میں بہت سی باتیں سُننے میں آئی تھیں۔ "سی آئی اے اور جاسوسی کا جال" حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشافات پر مبنی ایک ایسی کتاب ہے جو 'سی آئی اے' کے طریقِ کار اور حربوں سے ڈرامائی انداز میں رُوشناس کراتی ہے۔

ہمارے روشن دماغ ادیب جناب سیف الدین حسام نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اِس کتاب کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔

نیاز احمد

غالب خطوط اور نثر کے آئینے میں

مرزا غالب کی نثر

غالب کی اردو نثر اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ نثر زیادہ تر خطوط، رقعہ جات، چند ایک تقریظوں، کچھ دیباچوں، تین مختصر رسالوں جو برہان قاطع کے جواب میں لکھے گئے پر مشتمل ہے۔ بقول مولانا حالی اس کے علاوہ چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں۔ جو مرزا غالب نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ لطف انگیز اور دلچسپ ان کے خطوط ہیں۔ خطوط زیادہ تر اردوئے معلیٰ میں اور کچھ عود ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے۔ بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے۔

مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے رہے۔ لیکن اس سال یعنی ۱۸۵۰ء میں وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور "مہر نیمروز" پر کام شروع کیا۔ اس عرصہ میں انہیں ضرورت کے وقت اردو میں خط و کتابت کرنی پڑتی تھی۔ اسی سال میں انہوں نے سب سے پہلے اردو زبان میں خط لکھنا شروع کیا چنانچہ ایک خط میں خود لکھتے ہیں۔

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ سے

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں"

حالی لکھتے ہیں کہ غالب نے شروع شروع میں اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جس کام کو اپنے لیے حقیر خیال کرتا ہے اور اسے اپناتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ وہی اس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ یہاں تک دیکھا جاتا ہے غالب کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم فارسی سے نہیں ہوئی"۔ اگرچہ لوگ عموماً غالب کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے اور ان کے اردو دیوان کو بھی ایک عالی مرتبہ کلام سمجھتے تھے۔ غالب خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو لکھتے ہیں۔

"میرے فارسی قصیدے کو جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا مگر بہ طریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ داد سخن کہاں ادراک پایۂ معنی کہاں؟ مہر نیمروز یعنی تاریخ تمریہ کے پانچ سات جزو لکھ کر آپ کے پاس بھیجے ہیں۔ میری خاطر نہ کیجیے۔ انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہوگا۔"

غالب کے خطوط

مرزا غالب کی اردو خط و کتابت کا انداز سب سے الگ اور منفرد ہے۔ بقول الطاف حسین حالی "نہ مرزا غالب سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری نقل یا تقلید ہو سکی۔ انہوں نے القاب اور آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو خط لکھنے والوں نے نامہ نگاری میں لازم قرار دے رکھا تھا، بالکل ختم کر دیا۔ وہ خط کا کبھی میاں، کبھی برخوردار کبھی بھائی صاحب کبھی مہاراج اور کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بعینہٖ اس قسم کے الفاظ کے سرے سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے مطلب کو ادا کرنے کا ایسا دل نشیں طریقہ ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے دو شخص آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ: محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا، ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا، آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس مطلب کو غالب نے اپنے خط میں یوں ادا کیا۔

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا۔ غالب کو اس خط میں یہ لکھنا ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں

"اے میرن صاحب السلام علیکم حضرت آداب کہو آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ مگر میں اپنے خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اس خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر تم یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کے اصل خط لکھتے ہیں۔ بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں، وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"میر مہدی! جیتے رہو، آفرین، صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں کی گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا اللہ برکت دے گا۔"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ چونکہ الطاف حسین حالی بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے دھوکہ ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی مجروح ہی کی نسبت

لکھا ہے میری نسبت نہیں لکھا اسی قدر ان کو اس بات کا خیال زیادہ ہوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

انداز تخاطب یورپی انداز میں جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں ان میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا ان کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ ان کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا ہے؟ شاید قصے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

شوخی تحریر دیکھنا مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ شے جس نے ان کے مکاتیب کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ شوخی تحریر ہے۔ جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوت خیال جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، سیاسی، دینی اور معاشرتی مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیئے ہیں۔ سوانح عمری اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بہ لحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے آج بھی اپنا ثانی اور اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس درجے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق اور موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا لکھتے ہیں۔

> "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آتے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے۔ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچوں سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو ان کے بچپن کے زمانے میں، ان کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں ــ "اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاؤالدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں میں تو صرف تمہارا دلی دادا ہوں۔"

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انہوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اس کے جواب میں اس طرح ان کو لکھتے ہیں۔

"دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، ۱۸۵۸ء کے خط کے جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں۔ "دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مولف برہان کی حمایت کی ہے۔ ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اس کی اور اس کے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ ایک گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤالدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں ــ

> "استاد جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی بچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا ــ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام ــ اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں۔ بندگی ــ اور اس نظر سے کہ سید ہیں۔ درود ــ اور موافق مضمون اس مصرعے کے سوی اللہ واللہ ما فی الوجود سجود۔"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے ہیں ــ لکھتے ہیں ــ

> "دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

نواب علاؤالدین خان اور ان کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے باپ دلّی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤالدین خاں کو خط لکھتے ہیں ــ "سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ دو دن رہے۔ از راہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے تمہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اس کو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر ان کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا اللہ مالک ہے۔"

ایک دفعہ کثرت اخراجات سے تنگ آ کر بعض ضروری خرچ بند کر دیئے۔ یہاں تک کہ شراب پینی بھی چھوڑ دی۔ نواب علاؤالدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا اور مولوی حمزہ خاں صاحب کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ مصرع لکھا ــ

چو پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو   اس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر درباری مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، با ایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے، رامپور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آ گیا۔ گزارا مشکل ہوگیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے۔ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہے۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی۔ ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خان کو بعد سلام کہنا۔

اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما دیکھو ہم کو یوں بتاتے ہیں، دو روپے کے ہندوؤں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہو۔ اور مسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے۔ اور عرفا کے کلام و حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب اور ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں (نعوذ باللہ) مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ لامؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام: بریں زیستم ہم بریں بگذرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور الحاد کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں ——

سنو مولوی صاحب! تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا: "چل پیرشدی حافظ از میکدہ... الخ" اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ جس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ، اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے کہ ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں۔ "سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو حکم حبس دوام (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پیر میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی حبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد سے ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہیں رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چنّاں جان کی تعزیت میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں۔ "آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انہوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ..... کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ با آنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانہ ہو گیا ہوں۔ لیکن جانتا ہوں کہ تمہارے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور ہنگامہ عشق مجازی چھوڑ دو۔"

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنّاں جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا۔ مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی منّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت

کے ساتھ زندگانی ہے تو اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ گورا جیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ

زن نو کن اے دوست ہر نو بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے۔ اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں۔ حلیہ مبارک نظر افروز ہوا...... تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے؛ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے؟ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملاّ، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اس دن سر منڈایا۔ الغرض مرزا کے خطوط میں ایسے خط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں درج نہ ہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں: "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا کہتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خان کو لکھتے ہیں: "آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں۔ یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو جوان کے جنت آرامگاہ عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب! کیسے اور فلاں صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے حرمت! کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم صراف سے دام۔ قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے۔ اس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں۔ صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے اور تمہارے دوست تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو کوئی مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

ایک اور خط میں نواب علاء الدین خان کو لکھتے ہیں۔ "کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم تھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ — باقی سراسر ہنود! بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں...... امرائے اہل اسلام کی اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خان کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی یہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے صلحا و زہاد کے باب میں حرف مختصر میں نے لکھا ہے اس کو سچ جانئے۔"

عبادت میں یاس اور آمد اشک

غالب کے بعض خطوں میں بقول مولانا حالی یاس حسرت و افسردگی اور دنیا کی

بے ثباتی و بے اختیاری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا گیا ہے۔ جس میں ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں — "ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے، اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے، اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں — "تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع و بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا، دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ معاش ہو، کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی! ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پہ ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے، اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہو جائے گا۔"

مرزا غالب نے بعض خطوں میں اور خاص کر اردو خطوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات میں شمار کیا جاتا تھا خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان تھی۔ وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر غالب نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی آراستہ نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لازم ملزوم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن اور قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

مگر یہ واضح رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر ان خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کو خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر میں کرتے تھے۔ مثلاً یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ۔"

انہیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں۔

"اے میری جان، اے میری آنکھ!

نہ جیسے ان طفلے کہ در خاک رفت
چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم من جملہ واقعات کربلائے معلی ہے۔ یہ داغ رہے گا۔"

دیباچہ سراج المعرفتہ

غالب نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوط میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان دیباچوں اور تقریظوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو ان میں معذور سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے۔ وہ بغیر ان تکلفات کے ہرگز مطمئن ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا تھا۔ اس کو اس وقت بھی لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور مرزا کے وقت میں تو یہ بہت کم دیکھنے میں آتا۔ بایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی خاص روش میں نہایت ممتاز ہیں۔ خصوصاً وہ دیباچہ جو انہوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب "سراج المعرفتہ" پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں اس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ تفکرات اس سے پہلے اور مرزا اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب "سراج المعرفتہ" جس پہ مرزا نے دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں مفتی میر لال صاحب نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما پر تمام اشغال و اذکار جو آں حضرت کے زمانے سے اس وقت تک سینہ بسینہ سفینہ بہ سفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کر دیے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفت الٰہی میں کیا دخل ہے اور کیونکر ان کے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ دیباچہ مذکورہ کا اول و آخر چھوڑ کر صرف وہ حصہ جہاں مرزا

نے مذکورہ بالا معمّہ کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اقتباس دیباچہ "سراج المعرفۃ"

حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامۂ سربمہر پیچیدہ و سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے۔

"لا مؤثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مندرج ہے" لا موجود الا اللہ" اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنیٔ خاص کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آثاری و افعالی و صفاتی اور ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مراتب توحید سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء علیہم کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھا دیں اور حقیقت بے رنگ ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت تو اس امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے نہ بخیالی عامۂ مومنین کی کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے ان کی نظر میں نہیں۔ جب لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کہیں گے اس سے توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آرہے گئے۔ یعنی ہمارے اس کلمے سے مراد وہ ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمت اللعالمین ہونے کے اور اس مقام نے نامی ہے مرائے روح افزائے "من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ"۔ قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے۔ لیکن وحدت حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے۔ ایک جہت خالق کی جس سے اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کی کہ جس کو فیض پہنچاتا ہے۔

بنی را دو وجہ است دل جوئے خلق
یکے سوئے خالق، یکے سوئے خلق
بداں وجہ از حق بود مستفیض
بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" معنی اس کے صاف از روئے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے۔ نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے۔ نبوت خاص سے جس طرح نبی مستفیض ہے۔ حضرت الوہیت سے، اسی طرح ولی مستفیض ہے۔ انوار نبوت سے۔ مستفیض کی تفضیل مفیض پر اور مستفیض کی ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصہ نبی تھی۔ نبوت کے ساتھ منقطع ہو گئی۔ گمر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہے گا اور اب اس کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت و مشیخت ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو از روئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ مشہور ہیون امیون امت اور منظور نظر کاملان امت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات اب کہاں کہ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہے اور دل نور کی معرفت سے منوّر ہو جائے اور وہ عامن زبردست کہاں کہ قائل لا الٰہ الا اللہ کو اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو، قدم گاہ توحید پر قائم کر دے۔ یعنی رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اس کو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموعے موجودات کو کہ افلاک و انجم و جبال اس میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود جان لے ؎

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ
در زلف سخن کشودہ را خم و بپیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می دانی
ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بہ سبب استیلائے وہم مشاہدہ، وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں ہر چند انکو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے۔ ناچار اشغال و اذکار وضع کیے۔ تاقوت متخیلہ اس میں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بے خودی طاری ہو جائے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اسکو بہ جبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ واقعی ہمہ اوست ورنہ واقعی ہمہ اوست۔ وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔

پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا۔ بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بے خبری اور بے خودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بہ مجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آ گئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا۔ ایک کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا۔ انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں: یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں۔ مگر ہاں کم ہیں اور مخفی ہیں۔ اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بے خودی کے واسطے محتاج اشغال و اذکار ہیں۔ بہت بلکہ بے شمار ہیں۔"

"دیباچہ سراج المعرفۃ"

غالب کی فارسی شاعری

فارسی کلام میں غالب کا مقام

بقول مولانا الطاف حسین حالی۔ فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور نثر دونوں میں جو بلند پایہ انہوں نے حاصل کیا تھا اس کو اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ جبکہ اس زمانے میں، جب بہت سخن سنج اور نکتہ ور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدر دانی کی شکایت کرتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام کو دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیئے۔ اگرچہ مرزا انکو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو یا نثر) ہر قسم کے مضمون کو بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق ماہر استاد کو ہو سکتی ہے

لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ تصوف حبِ اہل بیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بے باکی، بیانِ رنج و مصیبت و شکایت اظہارِ محبت و ہمدردی، حسنِ طلب، یہ چند میدان ایسے تھے جن کا بیان مرزا کے تمام اصنافِ سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح واقع ہوا ہے۔

بے شک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان جیسا کہ ظاہر ہے، محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ زیادہ میل نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے مرزا اصنافِ کلام میں اپنی اس قسم کی شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے۔ عام طور پر نہیں پائی جاتی۔

اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دل آویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو۔ دلوں میں گھر نہیں کر سکتا مگر اس سے غالب کی مہارت اور استادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ "ایں شیوہ ختم است بر دیگراں" اور اس کا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا اور باایں ہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے مرزا کی استادی میں کیونکر فرق آ سکتا ہے۔ یہ میزان ہم نے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے۔ اس کو ان کے کلیاتِ نظم و نثر میں جانچنا چاہیے، نہ انتخابی اشعار میں جو ان کے دیوان میں درج ہیں۔

غالب کی فارسی غزل

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات بقول حالی قابلِ غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جس کا زمانے میں کوئی قدردان نہ تھا۔ ان کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے۔ یا بادشاہ اور سلاطین و امراؤ روسا تھے جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ شخص جس کا قصیدہ خاقانی و انوری کے قصیدوں سے ٹکر کھائے جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثر پھیکی اور بے مزہ معلوم ہو۔ اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔

گورنمنٹ کے ارکان کی مدح کے صلہ میں مرزا کو اس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہ ملا جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔ مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پر ایمان رکھنے والے بلاشبہ ملک میں بے شمار تھے۔ مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور ان کی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل نہیں بڑھ سکتا۔ پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا وہ حال ہو اور مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ چیز کہ جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہوتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں جو خواہ نخواہ اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اول لائق استعداد اور فطری قابلیت جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اس کو مستی کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں۔ اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے۔ بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اس کی قدر کرے یا اس کے کمال کی داد دے، اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسرے اس فطری ملکہ کو تحریک دینے والے اور اس آگ کے پتھر سے نکالنے والے کو اس بات کا یقین ہے کہ معاشرے میں کچھ لوگ ابھی تک حقیقت میں سخن فہم موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبعی اختتام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مگر حسنِ اتفاق سے اس آخری دور میں چند صاحبانِ علم و فضل دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے ہماری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی ثم دہلوی، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی عبد اللہ خان علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خان مومن، نواب مصطفیٰ خان حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد نیر، سید غلام علی خان وحشت وغیرہ۔ درحقیقت ان ہستیوں کا مرزا کے زمانے میں ہونا ان کی شاعری کے حق میں بالکل ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خان خاناں، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگوں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو بظاہر مرزا غالب کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ اس لیے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا۔ اس طرح نکتہ چینوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یوں قدردان اور نکتہ چیں دونوں ان کی ترقی و ترویج کا باعث تھے۔

مولانا فضل حق باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے۔ اس کا اندازہ حکایت ذیل سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انہوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا، آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن کی اس قدر تعریف کرتے ہیں۔ آج انہوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے۔ پھر وہ شعر پڑھا اور مرزا نے جو کچھ معنی کہے تھے بیان کیے۔ مولانا نے کہا۔ پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے۔ اس نے کہا۔ برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا کہ اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے کیے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی۔

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے ؎

اندریں شیوہ گفتار کہ داری غالبؔ
گر ترقی نہ کنم شیخ علی دا مانی

مومن خان مومن نے جس وقت یہ مقطع سنا تو اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح شیخ علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔ ایک صاحب نے جو مومن کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سن کر کہا۔ مومن خان نے اس لیے کہا کہ وہ اپنا مبلغ یقیناً شیخ علی حزیں سے بہتر و بلند تر سمجھتے تھے۔ ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

غالب اور خسروؔ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو یہ مراتب برتر و بالاتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خان کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعرا کی ابتدا ایک ترک یعنی امیر خسروؒ سے ہوئی اور ایک ترک یعنی غالب پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی اور ابوتمام ہو جاتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا ــ تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ جب تک مرزا کی طرز خاص کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے دل میں بیٹھ گیا تھا وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے۔ اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ مولانا ان کی سخن وری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے اس کے بعد ممدوح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں ــ

؎ باچنیں اندوہ کہ گفتم دل خالی نشد
خواہم از اندوہ گسارِ من نہ بوئے وائے من
آں کہ در یکتائی وے در فنِ فرزانگی
متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آنکہ چوں خواہد بنائش نامہ نامی ساختن
بر نگارد عقل مدائش کرم فرمائے من
دل چہ بیں دصنم نیا باید سخن کوتہ کنید
آں کہ ننگ ارسے بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بو علی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق کرنا اور عقل کا اس کو کرم فرمائے من لکھنا یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہم سر ہونا بھی اس کے واسطے موجب ننگ و عار ہے اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے۔ اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

بیدل کا اثر

غالب کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر آزردہ اور غالب اور بعض دوسرے مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی۔ فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے۔

؎ نشاط معنویاں از شراب خانۂ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ ورق اٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا: "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے۔" یہ کہہ کر غزل پڑھنی شروع کر دی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا غالب ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ ان کی عادت تھی۔ کہنے لگے "کلام مربوط ہے۔ مگر نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو گئے۔

صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور غالب نے اس طریقہ کو بالکل چھوڑ دیا تھا، اس لیے وہ مرزا اور مرزا ان کو کم مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی ان کی اصل ترقی کی بنیاد تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخرکار عرفی، ظہوری، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے ــ

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی طرف مائل تھی۔ لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے، دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بھی بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں۔ ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پر مربیانہ نظر ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ آملی اور عرفی کی غضب ناک نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔"

غزل میں نظیری کا رنگ

مرزا کے اس بیان میں پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے۔ مگر ان کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزل میں نہ صرف نظیری بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن طرز بیان کے

لحاظ سے نیظری کی کچھ خصوصیات نہیں معلوم ہوتیں۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں۔ جن میں عنصری سے لے جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر برآوردہ ہوا ہے۔ اس کا نام لیا ہے۔ ان کے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اُسے نقل کرتے ہیں۔ ناظم کہتا ہے۔

شنیدم کہ در دور گاہ کہن
شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی
بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن
بہ خاقانی آمد لب پر سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت
نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید
سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار
سخن گشت پیوند خسرو نگار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید
ز جامی سخن را تمامی رسید

اس کے بعد جو کمی ناظم ہروی کے بیان میں رہ گئی تھی۔ اس کو مرزا غالب نے یوں پورا کر دیا ہے۔

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید
ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

اگرچہ مرزا نے بیدل اور متبعین کی زبان اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے انداز بیان میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور اس ضمن میں اہلِ زبان کے طریقے سے تجاوز نہیں کرتے تھے، مگر خیالات میں بیدل کا اثر مدت تک قائم رہا۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔

غالب کی فارسی غزلیات کا انتخاب

شاہد ہستی تراود در روش دلبری
طرۂ پر خم صفات موی میان ما سوا
آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہنوز
جاں نہ پذیری بہ ہیچ نقد خضر را
بزم ترا شمع و گل خستگی بو تراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا
سادہ ز علم و عمل مہر تو ورزیدہ ام
مستی ما پایدار بادہ ما ناشتا
اے خاک درت قبلۂ جان و دل غالب
کز فیض تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را
تا نام تو شیرینی جاں دادہ بہ گفتن
در خویش فرو بردہ دل از ہر زباں را

●

حال ما از حیرتی پرسی و منت می بریم
آگہی بادے کہ آگہ نیستی از حال ما
خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
ز خود رفتیم و با ہم خویشتن بردیم دنیا را

●

وقت تاراج غم تست چہ پیدا چہ نہاں
ہمچو رنگ از رُخ ما رفت دل از سینۂ ما
جوشے از بادہ مجوئے ز وصل دارد و خلد
لب لعل تو ہم این ست و ہم آن ست مرا
خار ہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہ روان است مرا
دہر و نغمۂ دلکشتہ بہ آہم غالب
توشۂ برلب جو ماندہ نشانست مرا

●

سایۂ و چشمہ بصحرا دم عیشے دارد
گر از اندیشۂ منزل نبود رہزن ما
می پرد دود گر جاں بسلامت ببرد
تا چہ برق ست کہ رشتہ نامزد خرمن ما
سخن ما بہ لطافت نہ پذیرد تحریر
نہ شود گرد نمایاں ز رم توسن ما
ما ز بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

●

بزم دے حاسداں در دوزخ کشود فلک
از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما
سوز قرار داں ہمہ در خویشتن گرفت
از داغ تہمتے بجگر بستہ ایم ما
دلے سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم
شمع خاموش کلبۂ تار خود ایم ما

●

در مشرب حریفاں نشست خود نمائی
بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

●

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

●

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکی روزم نہاں
کو چراغ تا بجویم شام را
تا نہ پنداری کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

دل ستاں و در خشم غالب بوسہ جو
شوق تقاضا پیشہ ہنگامہ را

•

خواہم و دستش در خمیازہائی ما باشد
ز چشم بد نگہدارد خدا آں دست گلہا را
بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در دامت
تو دانی تا بہ سلف از خاک برداری کداما را

•

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب
فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب
گر پس از جور بہ انصاف گراید چہ عجب
از حیا روئے بما گر ننماید چہ عجب
بودش از شکوہ خطر و نہ سری داشت بہ من
بہ مزار من اگر از مہر بیاید چہ عجب
با چنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد
غالب از رشک برو دست نساید چہ عجب

•

غالب کی مشہور فارسی نعت

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است
آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است
تیر قضا ہر آئینہ از ترکش حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است
دانی اگر بہ معنی لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد
سوگند کردگار بجانِ محمدؐ است
واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار
کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است
ور خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

•

غالب کی شاعری پر ایک عمومی نظر

پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے ایک معرکہ آرا مضمون میں غالب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اردو تاریخ شعر میں دکنی شاعری کا دَور اس کا ابتدائی دَور کہا جا سکتا ہے۔ ابنِ نشاطی سے دوسری روایت شروع ہو جاتی ہے دہلی والوں نے شعر کا سرا پھر وہیں سے اٹھایا جہاں محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور غواصی نے چھوڑا تھا۔ لکھنؤ جا کر اردو شاعری پر ترصیع و تکلف کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ جس کے سیل کو شاہ نصیر اور ذوق کی محاورہ بندی بھی نہ تھام سکی۔ تاریخ شعر ایسے مقام پر اکبر آباد کا ایک نوجوان دہلی کی بساطِ شعر پر تازہ وارد کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ اکبر آباد میں اس کی تربیت نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں نہیں بلکہ بیدل، ناصر علی، نظیری، عرفی اور ظہوری کے دبستان میں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان بھی اپنے ارتقا کے ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کے ہندی اور فارسی اجزائے ترکیبی میں جمود سا آگیا تھا۔ یہ وسعت طلب تھی۔ لیکن شعرائے دہلی اسے محاورہ بندی میں قید کر رہے تھے۔ لکھنؤ کا دبستان اس کے حسن ظاہری سے کھیل رہا تھا۔ فکر کی توسیع کی جانب کسی کی توجہ نہ تھی۔

غالب نہ زبان سے مطمئن تھے نہ اسلوب شعر سے۔ ان کا ماحول نظیر آبادی کے عوامی ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ اس لیے کہ لڑکپن میں وہ اکبر آباد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں نہیں، محلسراؤں اور ایوانوں میں کھیلنے والوں میں تھے۔ اردو کے عوامی ادب سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں اپنے ہی نسب کا خیال جاگزیں نہیں تھا۔ اردو کو بھی وہ ایک درجہ اور ایک نسب دینا چاہتے تھے۔ اپنا ہی نسب یعنی ایران و عجم کا نسب اور ایسا انہوں نے کر دکھایا۔

غالب کی تمام شاعری میں اقبال کی مانند عورت مفقود ہے۔ اقبال نے عشق کی واردات کو ارضی یا مابعد الطبیعیاتی سطح پر پیش کی ہے۔ غالب کا عشق نہ جنسی ہے نہ رومانی۔ وہ حسرت و عشرت کا عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں حسن نسوانی کے مرقع نہیں ملتے۔ "زلف" "کاکل" "مژہ" اور مژہ ہائے دراز سے قطع نظر۔ انہوں نے اجزائے حسن یا اعضائے حسن کا کہیں نہیں تذکرہ کیا۔ غالب شاید اردو کے پہلے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے "غم روزگار" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ انسان کے لیے غم روزگار اور غم عشق لازم و ملزوم ہیں۔ ایک جگہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ غم سے نجات نہیں۔ غم عشق کم ہونے پر بھی غم روزگار چھوڑ جاتا ہے۔

متاع و منزلت کی حسرت غالب کو ساری عمر رہی اس حسرت نے اردو غزل کو ایک نیا موضوع دیا ہے۔ موضوع سخن کی حیثیت سے غم روزگار کا تذکرہ غالب کی غزلوں میں کافی ملتا ہے۔ غالب کی مقبولیت کا یہ بھی ایک راز ہو سکتا ہے۔ لیکن "دنیا" کا غم تو زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ غالب کی شخصیت انوکھی اور پہلودار نہ ہوتی تو شاید ان کا کلام اس درجہ فکر انگیز اور دل نشیں نہ ہوتا۔ غالب نے غزل کی روایات سے بہت گریز کیا اور اپنی فارسی دانی اور شناسی سے اردو کو ایک نئی حیثیت دی۔ ایک نیا لہجہ بخشا۔

غالب کے کلام میں موضوعات کا تنوع ہے اور ہر موضوع کے اظہار میں ان کا مخصوص طرز بیاں کارفرما ہے۔ غالب کے ہاں جذبے کی شدت یا حرارت تو نہیں ملتی جو میر کی شاعری کی جان ہے لیکن غالب کا بہترین کلام جذبے سے عاری نہیں یہ جذبہ خیال کے تہ در تہ نقاب میں نمودار ہوتا ہے۔

•

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

اس طرح کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ۔۔۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب کی غزلوں کی ندرت ، ان کے فکری پہلو میں ہے ۔ اگرچہ غالب کے ہاں ہمیں کوئی مستقل فکر نہیں ملتی۔ لیکن عام طور پر غزل اسے قبول بھی نہیں کرتی اور غزل میں اس کی روایت بھی نہیں ہے ۔ یہاں زیادہ تر شاعر کا موڈ طاری ہوتا ہے ۔ غالب کی مابعد الطبیعاتی سطح وحدت الوجود کی سطح ہے ۔ استعارے اور کنائے بھی وہی ہیں جو اس حقیقت کے اظہار کے لیے فارسی اور اردو شعرا استعمال کر سکے ہیں ۔

غالب ایک چابکدست فنکار ہے ۔ وہ شعر نہ تو رعایت لفظی کی خاطر کہتا ہے اور نہ صنعت گری اور بازی گری دکھاتا ہے ۔ لیکن بات کہنے اور اسے سامع کے دل میں اتارنے کا ڈھب اسے خوب آتا ہے ۔ وہ علم بلاغت کے تمام تصنع و ترصیع کو موقع و محل کے لحاظ سے بر سرِ کار لاتا ہے ۔ اس نے ایسی صنعتیں استعمال کی ہیں جن کا کتبِ بلاغت میں کوئی نام نہیں ۔ اس سبب سے اس کا ہر لفظ بلاشبہ گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتا ہے ۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ ابہام کے کتنے اقسام ہیں ۔ کب شعر کے لیے یہ زلفِ گرہ گیر کا حکم رکھتا ہے اور کب زنجیرِ پا بن جاتا ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے ۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لفظوں کے استعمال کا جیسا غیر معمولی شعور غالب کو ہے ، اردو کے بہت کم شعرا کو ہے ۔ ایک طرف انہیں فارسی فرہنگ و آہنگ پر عبور ، دوسری طرف دلّی کے روزمرّہ اور محاورے پر دسترس ۔ یوں غالب نے بلاشبہ اردو ادب کی محفل میں ایک انوکھے انداز سے بساطِ شعر آراستہ کی ہے ۔

غالب اردو اور فارسی کے شاعر تھے ۔ ابتدائی کلام زیادہ تر اردو کا ہے ، دوسرے دور سے فارسی شاعری پر خاص توجہ ملتی ہے ۔ دو زبانوں کا شاعر ہونے کی حیثیت سے اس بات کا امکان تھا کہ ان کی دونوں زبانوں کی شاعری میں ایک جیسے اشعار کثرت سے ملتے ۔ تعجب ہے کہ ایسا نہیں ہوا ۔ صرف چند ایک اشعار ہیں جن کا مطلب ایک جیسا ہے ۔ مثلاً ملاحظہ ہو ۔

فارسی

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

اردو

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

فارسی

ہائے این پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد
بود با دامن پاکت چہ قدر ہا گستاخ

اردو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی جاناں کے دامن کو کبھی میرے گریباں کو

فارسی

گہے بر گوشۂ دستار داری
خوشا بختِ بتو یا عب نال

اردو

تیرے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

فارسی

دگر ز سازِ بے خودی ما صدا مجوے
آوازۂ از شکستنِ ساز خودیم ما

اردو

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فارسی

شکستہ رنگیِ تو از عشق خوش تماشائیست
بہار دہر بہ گلچینیٔ خزانِ تو نیست

اردو

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

فارسی

لالہ و گل دمد از طرفِ مزارم پس مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود

اردو

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب اور مثنوی

ایران کی قدیم کلاسیکی مثنویوں پر غالب کی بڑی گہری نظر تھی ۔ جامی ، نظامی اور فردوسی کی روایات سے وہ پوری طرح باخبر تھے ۔ اس کے باوجود غالب فارسی یا اردو میں کوئی قابلِ ذکر اور بلند معیار کی مثنوی نہ لکھ سکے ۔ بقول رشید احمد صدیقی ۔۔۔

> غالب میں عقیدہ و عمل کی اس تپش و توانائی کی کمی تھی جو بالعموم مذہب اور ماورائیت کی دین ہوتی ہے اور جس کے بغیر بڑے کام انجام نہیں پاسکتے ۔ غالب میں عصبیت بھی آئیڈیلزم نہیں تھی ۔ غالب نے فارسی میں متعدد مثنویات تصنیف کی ہیں جو اپنی جگہ پر خوب اور بہت خوب ہیں ۔ ان میں سے ایک بیانِ معراج بھی ہے ۔ اس میں جہاں تہاں مولود شریف کا انداز آگیا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس کی غالب سے کم سے کم توقع کی جاتی تھی ۔ معراج پر لکھنے کا غالب کو حوصلہ بھی تھا اور صلاحیت بھی

لیکن جن مکروہات و مصائب میں وہ مبتلا ہوگئے تھے ان سے نجات نہ پاسکے اور نہ عہدہ برآ ہوسکے۔ معراج دراصل مجاہد، مفکر اور صاحبِ یقین کا موضوع ہے۔ جب تک شاعر یا فنکار میں یہ تینوں صلاحیتیں موجود اور بروئے عمل نہ ہوں گی۔ اس موضوع پر کوئی بڑی نظم یا مثنوی نہیں لکھی جاسکتی۔ مذہب و ماورائیت سے قطع نظر غالب اگر انحرافِ عظیم یا انکارِ ابلیس پر کوئی مثنوی تصنیف کرسکتے ..... تو یقیناً ان کی غزلوں سے وہ کم مقبول نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ اردو مثنوی کی قدر و قیمت میں جو گراں بہا اضافہ ہوتا اس کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر غالب کیا کرتے۔ قدیم مثنویوں کی رزم اور بزم کی داستانوں کے لیے جس طرح کی اساطیری فضا، مافوق الفطرت کردار اور ان کے محیر العقول کارنامے سازگار ہوتے تھے۔ اب ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی۔ انسان نے خارج پر اتنی قدرت حاصل کرلی ہے کہ تخیل کی عجوبہ تراشی کا کیا ذکر، ماہ و مریخ کی تسخیر میں بھی کوئی کشش نہیں رہ گئی۔ "

"غالب کی شاعری" (غالب نمبر۔ نقوش)

غالب کا لہجہ

غالب کا بات کرنے کا سلیقہ سب سے الگ ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ جدت پسند ہے اور اس کی افتادِ طبع سب سے الگ اور شاعری کی قدیم روایات سے مختلف تھی۔ مثلاً خدا اور انسان کا رشتہ ایک تو غلام اور آقا کا ہے۔ اور دوسرا اس کے نائب ہونے کا ہے۔

غالب کے ہاں خدا اور انسان کے مابین جو رشتہ ہے اس کے متعلق بھی ہمیں اس کا لہجہ اور انداز سب سے الگ قدیم روایات سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بقول رشید احمد صدیقی ایسا بھی نہیں ہے کہ خدا کے نائب اور نمائندے کا ہونا چاہیے۔ وہ خدا کی عظمت و رحمت کا اتنا احترام نہیں کرتے جتنا اپنی ذاتی محرومیوں اور حسرتوں کا ماتم کرتے ہیں۔ غالب جبر پر بھی طعنہ زن ہیں اور اختیار کا حق ادا نہیں کرتے مثلاً۔

؎ ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو

؎ ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

؎ لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

غالب اور شراب

غالب پہلا شاعر ہے جنہوں نے شراب کو اپنے لیے عیش و عشرت کے واسطے نہیں بلکہ یک گونہ بے خودی کے واسطے جائز سمجھا۔ وہ شراب دنیاوی غم غلط کرنے کے لیے نہیں پیتے۔ وہ اپنی حسرتوں کو دوبالا کرنے کے لیے نہیں پیتے بلکہ محض بے خودی کی کیفیت کی خاطر پیتے ہیں۔ یہ بے خودی غمِ روزگار سے نجات نہیں بلکہ حقائق سے باخبر ہونے کی تپش سے نجات حاصل کرنے کی سعی ہے۔

؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

شراب کی حرمت اور محبت میں غالب نے جو اشعار کہے وہ صرف اردو کا حصہ ہے۔ فارسی میں بھی ان کے ہاں شراب کی تعریف و توصیف میں اتنے بلیغ اشعار نہیں ملتے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

•

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

•

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

•

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

•

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

•

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

•

غالب کی فارسی نثر

مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جاتا ہے۔ ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے۔ بخصوصاً کلیات نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں، اور مکاتبات کا ایک معتدبہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پولیٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید اور ملا طغرا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ ان کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے۔ مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بے نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈھنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل وغیرہ کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کرکے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا

کی کوئی ادا ان کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں ان کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ ان اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اس کی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے۔ مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ انتخاب کرتے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ووافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اس قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظم فارسی میں ان کو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تاوقتیکہ اس کو دلیل اور زبان سے ثابت نہ کیا جائے ایک بے معنی بات ہے لیکن ہم کو ان لوگوں سے جو وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں، امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں۔

چونکہ مرزا کی انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم ان کی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کریں گے جو صاف اور سلیس ہوں اور بایں ہمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین السطور سے کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائیں گے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً صد کو سد شصت کو شست غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ وغیرہ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اس لیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقہ کے موافق لکھے گئے ہیں۔ نادرہ سلیماں آردہ سازی۔ مصطفوی توسیلانا۔

نثر فارسی کے نمونے

مہر نیمروز خطاب زمیں بوس۔ مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح پادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کرکے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطاب زمیں بوس رکھا ہے۔ اس کو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

ما آں شیوۂ خاقانا د خواقین خدائیگانا روئے آوردن من از عدم بوجود بسودائے گہر سنجی و گہر فروشی بود، کالائے جنبش بہائے سخن دریں چار سو روائی نپذیرد، و متاع گرانمایۂ مراد دریں بازار ارزش ارزانی نہ شد، ناچار ہرچہ باخویش آوردہ ام۔ چوں گویم کہ با خویش می برم (قدر و قیمت)۔ لختے در سفینہ ہا و پارۂ در سینہ ہا میگذارم، و میگذارم و میگذارم (چگونہ) پس از من آں گنج شایگاں را اگر ہمہ باد ببرد گو ببرد و اگر ہمہ خاک بخورد گو بخورد۔ سینۂ آرزو ہائے جواں میرا (جواں مرگ)، مدفن است و معرکہ گرم (بالکل) چراغ گو ہیچ مباد۔

نیاگان نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند و فرمانہا با فر و فرہنگ (اجداد) فرہ۔ مردان (نسل) چراغ ہستی تور و دیدۂ تور بہ باد آتش کینۂ کیخسرو بخشیاں طلبند۔ سپاہ پیشی آوردہ و خداوندان اورنگ و دیہیم (تاج)، داماذاں برگ و ساز جز تیغ گند ناگوں بخت نماند، برز بوم بیگانہ روی آوردن۔ و بدست مزد تیغ زدن ناں خوردند ہم ازیں نیستان (ملک) ایرانان کہسار نشین، سلجوقیان و گرہ بادہ سر با فسرو افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردندہ چنانکہ خوی اوست ایں نامداران کا دس کوس را نیز از پای افگند۔

در مشرب ما خواہش فردوس نجوئی　　در مجمع ما طالع مسعود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما درد نہ بینی　　در آتش ہنگامۂ ما دود نیابی

از والیان ایں قافلہ نیائے من کہ در قلمرو ماوراء النہر، سمرقند، مستقر او اسلاف بود چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہند آمد (جائے ولادت)، و در دفتر سپہدار شاہ نشان ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں توقیع نوکری شاہیش نوشتند و پرگنہ پاسو برات روزی وے و سپاہش نوشتند، پدرم پیشۂ پدر خویش داشت، و ہم در کارزار جامہ گذاشت۔ ہمانا گیتی شناسے ترا آئین نوا سنجیدے می بایست کہ مرا از مرز روشناسائی آفریدند۔

رباعی

غالب بگہر ز دودۂ زادشمم　　زاں رو بصفائے دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر　　شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

خاکم بسر کہ بغریب پنداری آزادہ روی بہ سخن لاابالیانہ پرداختم؛ و اندازۂ ارزش سخن و پایۂ والای گوہر خویش نشناختم، سینۂ من نفسے داشت برواں آسائی نیسے کہ از نشتر زدہ و نوای از بال زدہ من کہ دم جز بہ پا پست نزدم عرفان مرا قلمے بود۔ بر دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد بیہودہ کوشش۔ من کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم۔

با ایں فروغ گوہر و رخشانی نہاد　　زیں سال بیاورد گر اکنوں زادگاہ

با فر و فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرمایگاں ہمنشیں، و با اوباش ہمرنگ پاے بیراہہ پوے، و زبان بیہودہ گوے، در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار، دل پر از خار خار و دیدہ نشترہ زار من روز گاہ خود نمائی آوا ایستم، و ہمرو برگ آزاد از آسائش سرگذشت ہر کس ہماں فرماں ہائے امضا پذیرفتۂ سرنوشت اوست، و آنچہ بر من رفت دوستاں را با من چہ جائے سرزنش و مرا با دشمناں چہ گنجائش پرخاش۔

ننگ گسستہ گنجائش ز عمر کشتی شکستہ موج　　دانا خورد دریغ کہ تاواں چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتار من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت و خانقاہ و میکدہ را بہم برگزید، بفروغ آں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بہ فر آب دادگری دل افروخت، و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت بداں در فرود آمدم و در مدرکہ خیز چاں حلقہ۔ چینے بداں در داری و نوائی کہ دیدہ ببالش۔ تا ہمسایۂ اوج پہریاں در سایۂ من اندو تا خاک نشیں آں در م فرشتگان در رشک پایۂ من اند۔ و دل و دیدۂ دوستاں جلوے من است، و پر سراہ و ستارہ پایۂ من دریں گوشہ گزینی و خوشہ چینی (استادگاں) نخست آیۂ رحمتے کہ بر من از بالا فرود آمد، دو در اوں خجستگی بزمین بوس گیہاں خدیو خداوند اں بود، دولت روے آورد، بخت از خواب جست، و در چشم روشنی گفت رضواں برضا جوئے آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ تجلی طلبید

(نثر)

نومیدی از تو کفر و تو راهی ز بکفر   نومیدیم و گر به تو امید وار کرد

کاہ خاکی مرا چوں پیکرِ گرد باد جانے در میان نیست ہمیں یک دو دم سرگشتگی تماشا دارد۔ گر عندلیب گلشن تصویرم کہ بوے گل زمزمہ از دے تواند دمید یا سبزہ جوہر شمشیرم کہ بوزیدن باد مستانہ نیارد جنبید۔ گسستگی پیوند نشاط کہن شدہ خوں ازدلی ہمچناں در چگیدہ نشست (نخواند) تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بر زور گسستہ اند۔

شبے بادل دیوانہ کہ لختے از من ہوشمند تر ست۔ گفتم کہ اگر بگفتار میزد ہی بشادم کارگاہ بارگاہ عرصہ دادم کہ آئینہ دار زم۔ مرا می تواں ز دودہ بندہ، سخن طرازم، مرا می تواں پردہ گفت۔ اے ناداں ایں سخن از جائے دگر بود و ہنگام آں گذشت اکنوں اگر ہمی توانی گفت بگوے کہ خستہ ام مرہم می تواں نہاد، و مردہ ام، جان می تواں بخشید۔

رباعی

شاہا ہر چند دارہ جوے آمدہ ام   دانی کہ چرا بہ نغز گوے آمدہ ام
آبم کہ بجلوا بجوے آمدہ ام   رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چانکہ بدوران تو ام۔ بروزگار فرزانہ جمشید بودے، جمشید روزگار مرا آفرین گفتے، و اگر بہ انساں کہ ثنا خواں شہریارم فرخ فریدوں را ستودے، فریدوں چرخ دستارہ را گمو سر گشتے، و در انجمن کہ زر دشت آتش افروختے اوژند آورد۔ اگر من بدیں دم آذر فشاں جادو اختے آوازہ ہم من زبانہ نہ زدے اندر عربی بیان من کس بشنیدن ژند نپرداختے من بدیں فرخی بخت   کہ چوں تو خداوند کار فرما دارم۔ ہر قدر بہ خویشتن بنازم جا دارد سرت گردم! تو نیز بدیں گرمی ہنگامہ ناز کہ ہمچو غالب بندہ آتشیں نوائے داری، اگر بہ اندازۂ ہنر داد التفات میدہی جائے مردمک دیدہ لبن بازگزار، و دیدل بر دے من بگشائے۔

گر بندہ در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بفرمان آں خسرو دریا دل کلیم را صدرہ؟ بسیم و زر و لعل و گہر سنجیدہ اند   امن آں خواہم و بدہ و داں دا ستودی۔ وہی تا از کشش ہر کوشش نہ   دبلند ویکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسنجد۔ پریشان زنی من در ستایش گفتار خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردے و ہیچگاہ بر خود گمان کمالے نبردے سرمستی ذوق برگزیدن ایں والا نظر کہ برگزیدۂ تست مرا از من بجود و خامہ بے پروا بوے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد۔ ہمانا بلند نامی سلطان دہر در آفاق چشم داشت، چوں منے را کہ بجادو بیانی شہرۂ آفاقم بگرداد گزاری گماشت۔ من خود از اں رو کہ دل و زبان ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زباں شاہ است   دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمود فرمان شاہ ست۔

بادشاہاں را ثنا گفتن نہ کار ہر کس ست   دیدہ ور شاہے کہ کار گفتن انداز و بمن

نامہ نگار کردار گزار داپہ تنو مندی توفیق سرانجام خدمت۔ سعادت جاودانی خاقان را بر سایہ سواد ایں نگارش کہ ظلمات آب حیوان ست حیات ابد ارزانی باد۔

فخریہ فقرے

مرزا نے مہر نیمروز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ہے اس کے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائے گی۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

کالا شناسی را از آں آئین ست کہ نکوئی کالاے خویش از نظر انداز ند و برکشائی راز آں دستور ست بر سر پیکیے کہ خود کشتہ عشق نہ بازند، گرمانی آں نقش (مصوری) را کہ خود میزوا از اعجاز نمی شمرد؟ و آزر آں بت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ دیگر آں را بندہ سپاس گزار باشم اگر قلم را بہر جنبش آفریں بگویم، و از سخن بہر اندیشہ سپاس نپذیرم۔ رفتار کلک و گرد رو دل از دست برد و خرام ایں؛ عالمیت و قاص سرمست نکند۔ حاشا کہ خرامش کلک بر ورق ایں مایہ ذوق انگیز تواند بود۔ تیر ست کہ بیلہ در حالت سرمستی تقسیم خود نمایانہ بنازی خرامد ایں پارسی آمیختہ بہ تازی   کہ از زبان   چیرہ دستی عرب بر عجم در گیتی پدید آمد خسروی گنجینۂ دربستہ بود کہ خامہ من قفل درش   را کلید آمد۔ پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام۔

خسروی بادہ دریں دور اگر میخواہی   بیش ما آے کہ جرعۂ از جامی ہست

خود ستائی فرد ہم و بند پند انگسلم۔ آدم از اں روزگار کہ از خوے بناسازی دانکہ بیازی سپری شد، وداد از اں بہ داد گرد روزش افزونی خشم و کام بر دواں دہوش رفت۔ از کار فرمائے ایں نگارش سپاس پذیرم کہ بہ پرداختن ایں نقش کہ خود را چوں مایہ بازمیں ہموار ساختہ ام، تا پرداختہ ام دبا نگیختن ایں نقش، کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام۔ دست از کارہائے دگر کوتاہ است، و دل از اندیشہ ہائے دگر برکنار تا مہ نگاہ کہ از کہ وارگزاری بگفتن و دل روی آوردہ بود باز بہ پاے سخن می آید، و جادہ گر نشان دادہ اندمی بپاید نگر نگاں ہمہ تن چشم باختہ و شنونہ گاں سراپا گوش۔"

طرز واقعہ نگاری

مرزا نے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اس کی بھی لکھی جاتی ہیں

"خان خطا با خویشتن سنجیدہ کہ با قہرماں قوم مغل مہر و رزد و ہراگیز نامہ در دل داشت دگزیدہ دوستے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت۔ فرستادہ آمد و جہاں پہلواں قبل خاں را زمین بوسیدہ، و نامہ سپرد، و پیام گزارد و مرغ دل آشتی بود نہ در فرو گذاشت تا جولی جادو را بجائے خود نشاند و بہمعنانی نامہ آور توسن تیز گام سوے خطا راند و فرمانِدہ آں کشور مہرانگیز را پذیرہ فرستاد، و مہماں را بجوخترمیں نشین فرود آورد۔ دو پادشاہ سپہر بارگاہ بر یک خوان نشستند، و نان خوردند و راوق آشامیدند۔ گر خرد پیشہ قبل خاں را در اندیشہ گذشتہ باشد کہ مبادا خطائیاں زہرے بہ بادہ آمیختہ بدیں دنگ خون مہمان ریزند، در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تا ختن بروں آمدے و بہ سرتم شگوفہ کردے و خوردہ آشامیدہ از دہن فرو ریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے دگر بادہ ساغر گرفتے و خوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فرو ماندہ کہ یارب ایں چہ نیرو مندی ورد آورکسی ست کہ از ما بیشتر می خورد و خورش را بر دے گرانی نیست و ہے از افزونی ترمی کشد و ہشیار تر از ماست۔ میگساراں دانند کہ چوں بادہ پُر زند و دمادم خورند ہر چند ہر بار شگوفہ اندازند۔ نہ آنست کہ مستی روے نہ دہد و تا بے در زبونی قے منش را باہم برنزدند۔ بے بادہ بر خرد زور آورد و قبل خاں ریش دارا ے خطا

کہ النا خاں نام داشت. گرفت و بسوے خود کشید و ناسزا گفت، میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکان خود را کہ بہم برآمدہ بودند از گستاخی باز داشت. بامداد آن مہمان آہنگ بازگشت سر کرد. میزبان کہ از بدمستی دوشینہ سرگراں بود چنانکہ میزبانان دامن مہمان ز دو از دست نہ دہند، و آرزوے دیر ماندن کنند. نمد و کلاہ ہائے گوہر آگیں، و کمر ہائے زریں، و درخشندہ نگیں ہائے بیش بہا، و برلستہ ہاے پرنیان و دیبا پیش کشید، و پدرود کرد. ہنوز رہرو دو رہ نرفتہ بود کہ بدآموزان النا خاں را از جائے بردند، و برآں آوردند کہ قبل خاں را، از راہ برگردانند و بدرگاہ آورند کالبدش را بدست و خنجر از ہم فرو کشایند سخن بزمی گذارند، ستارہ از سپہر فرود آرندہ ہرین کار کمر بست و قبل خاں را برہ دریافت، و بہانہ آمدن فرایفت رمیدہ رام نشد و از راہ برنگشت فرستادہ تنہا باز آمد و بغز سندہ خبر داد گروہے از گرداں و یلاں فرماں رفت کہ جلو گسستہ شتابند و ہر کجا یابند اگر بشادی در او نیاید بخواری و زاری آورند. گر قبل خاں را براہ دوستی بود از دودہ ستودہ سلجوق بکاشانہ وے فرود آمد. وا کم از سپہر آسائش آہنگ. و دو سہ روزہ آبخور داشتہ باشند خطائیان شوریدہ مغز در آں دہ رسیدند، و خان را و راں خانہ دیدند سخن بداں راہ ساز کردند کہ خاقان فریب خوردہ، و خواست کہ سوئے خطا برگردد و خانہ خدا کہ غمخوار مہر فروں داشت منعنہ بادپائے پیش کشید و گفت کار را دگرگون ست بر رفتن بخطا خود بہیچ روے روا نیست. تنہا بریں گروہ مہا دینہ و بریں بادتوں نام برنشین، و سوئے اہل و الوس بگریز. ناگزیر جہاں کردہ جان گرامی بہ تیز گامی برد خطائیاں روئے بازگشتن نداشتند بے امید گاہ تنگا پوئے خویش. بردا شتند خاں سپہر آستاں نخست بآرامش جا رسید و خطائیان سپس بآ قاجولی بہادر و فرزانگان سگالش رفت کہ چہ می باید کرد و انجام کار سبہ یکہ گرد خواہاں داشتند، تا زتمنیکہ کشتند چہ دیدند.

شہریار قبل خاں از یک بانوے نکوسیار کہ از قوم منغرات بود شش پسر داشت نخستیں را روزمیں برادرگین برقاق و قوبلہ خان نام آورد و دیگراں بنا جہانے دیگر روشناس. روزے نخستیں ایں دو برادر نام آور ناگاہ بشکارگاہ از ہمرہاں جدا ہمی ماند، و راہ گم کردہ ہرزہ ہمی گردد تا تارخانیاں کہ غارتگری پیشہ داشتند، و پیرامن قلمرو مغول ہموارہ راہ میزدند بایں شہسوار پریشان روزگار برخوردند. و چوں می دانستند کہ کیست باسیری می برند و بالتا خان خطائی می سپرند تا خاں کرد بے برداشت فرماں می دہد کہ شاہزادہ را بر خرچو بیں بہ میخ ہائے آہنیں بدوزند تن تا ز منیش اندوہ آں بیداد ندیدہ، نسبتاں را کہ از پیش رنجور بود جگر تابی ایں داغ درد افزود چوں دانست کہ کام ہمی باید مرد و ہیں پسر خویش قوبلہ خاں را بہ جانشینی گزید. و کشیدن انتقام خون برادر وصیت کردہ چشم از تماشائے جہاں پوشید قوبلہ خاں بہ تمکین سلیماں بگاہ آمد و بفراہم آمدن سپاہ فرمان بشت فرماں براں و کینہ خواہاں از ہر سو بہ تخت گاہ روآوردند.

شہنشاہ رااز دل دیدہ درد | کہ چوں لعل بودے سراپا جگر
براں شد کہ لشکر فراہ آورد | بسوے خطا ترکتاز آورد
ز مرداں دگر داں وکند آوراں | بجنبش در آورد کوہے گراں
از آں رو کہ بایست خونریز شد | منش با جنوں رنجیں تیز شد
دلیراں بہ دشمن کشی دم زدند | ز دم باد بر روے پرچم زدند
ز تاتار تا گرد انگیختند | بہ بنگاہ خان خطا ریختند

النا خاں دل و دست دشمناں بکار در آورد، و خود با سپاہے از ستارہ شمار افزوں تر بہ پیکار رہ آورد و کوشید و کوشیدن سود نداشت رقم فیروزی بنام قوبلہ خاں کشیدہ بودند. شکیبائی گسل شکستے بہ خطائیاں افتاد علم بادشاہ نگوں شد و اندیشہ گریز رہنموں جانیاں النا خاں گشت گریختن جاں بردن ہائے خستہ و دلہائے شکستہ از میاں برد بشہر اندر آمد و در برروے سپاہ کینہ خواہ بست. قوبلہ خاں و لشکر، نہ آنمایہ برگ و ساز پیکار بود کہ در اندیشہ گنجد سپاس گزار چرخ و اختر گشتند، و گرانبار و سبکعناں برگشتند. بادشاہ بچشم روشنی پیروزی و بزم سور آرائش یافت خواہی جنگاہ گرم کن و خواہی بزم آرائے برگ ساز آں خدنگ بہ کماں ست کہ خطا نکند، قوبلہ خاں، را بہنگام خویش ناوک بر نشان خورد. چوں پسر نداشت برتاں بہادر جائے پدر را ز برادر گرفت بلکہ دلیر و مردانہ بود نامش از خانی بہ بہادری در جہاں رفت برونگار جہانداری ایں شہریار و لادر برق اجل خرمن ہستی قاجولی بہادر سوخت، و پسرش از دمی برومش پسر لشکری رنج افروخت.

روزے میانہ امیر قزغن و امیر طرافاغائے درباہ الوس و گفتوں سخن می رفت و فرزانہ فرزندی فرا امیر تیمور دلاور باپدر ہمزباں بود. پدر را از گفتار باز داشت خود بشگرفی سخن سرائے شد، و بداں ہنجار نغمہ چند برتار گفت زد کہ امیر قزغن درآں شیوہ بیانی و گہر افشانی بہر دل بست و بآفریں زباں برکشاد و سخن گوے فرو بیدہ اراد اپسر خواند، و ہمدمان بزم.

اولجائیو ترکان

خواہر امیر حسین نبیرہ خویشتن را بآئین دین و قانون شرع
بوے سپرد | تا خویشی بر خویشاوندی افزاید

و آمیزشے چوں شیر و شکر در میاں آید. امیر جہاں بوے پس از آں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشیں و ہمدم و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے رزم بر آزمایان برلاس و دلاوران چغتائی ہر کہ آں دست برد نمودے شگفتی فرو ماندے

دو نکتہ مرید او گویا ہماں | دست و بازو آفریں خواندے

پس از امیر قزغن کہ داماد ش تغلق تیمور ناگاہ در شکارگاہ اش کشت جہاں پہلواں تہمتن تواں بہ تنہا اریں ہمت والا گرفت و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت.

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ | در عہدہ رحمت خدائیم ہمہ
در جلوہ دید چناں کہ مائیم ہمہ | شائستہ نعمت و لوائیم ہمہ

برادر زن صاحبقراں یعنی امیر حسین نیز بوے پیوست، و عہد بست کہ ہر چہ از ملک و مال و برگ و ساز گیرد آید بہ یکدگر بخشش کنیم و باہم جز مہر، و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نہ ورزیم. بجون گرمی ایں دو گرد دلاور و دو شیر مرد ہم گہر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں و ستگاہے و سترگ سپاہے فراہم آمد. صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگی دل باز باں یکے داشت و امیر حسین ہموارہ در کمیں آں بودے کہ تا ذرا از میاں برد و بیکتائی علم دارائی افرازد از دیدہ وری بسگالشہائے آں نثر ند اندیشہ ناراستی پیشہ پے بردے و از فرزانگی و مردانگی ہیچگاہ بروے نیاوردے

ستم بجان کہ اندیش می تواں کردن | تحمل ز راستی خویش می تواں کردن

روزگارے بداں نزاد رستہ طول امل با ملوک طوائف و رکہجاہ دمریز ستیز و آویزہ گذشت ہمگناں چشم براہ گوش بر آواز داشتند تا یل اسفندیار نیز در از کدام سو چشم زخم رسد. دیرۂ امیر حسین کہ جز بر بود خویش در جنگ و بیرنگ کار نمی کرد.

دو را انبازی و دمسازی. فتنہ پردازی و شعبدہ بازی شیوہ داشت. نیرنگ سازی اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را نازم کہ ہم آں گروہ بے شکوہ را سوے بہ جنگ خود کشید و ہم ایں گروہ بے دستبرد را بجا دست از کار رفتہ. صدرہ اتفاق افتادہ است کہ ایں نفاق پیشگان خود دشمن خون گرفتہ را از بنگاہ چغتائیاں دست گرفتہ بر تکیہ گاہ خانی و مرزبانی نشاندہ اند و زود دیر بہ شمشیر بر سرش راندہ اند. تنہاے پیلتناں دامن دو تیغ از پئے ہم ہیچاں بود، سرہاے سروراں دانا بالش و خشت گور از پس یکدگر آمدہ.

سپر شارہ دو دوغ چرخ نیلگوں | اینہا کنند ہر آئینہ در مذہب حکیم
اما من آں نیم کہ پسندم طریق وہم | زاختر چہ شکوہ چوں نبود جز قسیم
نبود بجز ظہور صفات و شیون حق | صلح و نبرد و فتح و شکست امید و بیم
توقیع معنویست گر الطاف و رحم | تشریف خسرویست گر الطاف کریم
از حق بود اضافۂ ہستی بہر صفت | جز داد بتو داد چہ بسائل دہد کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتادہ است و سلطان سام ہم آورد، افراسیاب ہمتا. بہ لابہ گری وے بخشودہ بیاری و یاوری دل نہادہ است، کینہاے نہانی امیر حسین آشکار الود ہمی دانستند، و خدیو ہمہ داں از بہر فزوں تری دانستہ کہ ہم ضمیر حق پذیر آزارم ناگزیر ہی گزشتہ باشد کہ گمراہی سست مہر خواہاے زشت و کردارہاے نکوہیدہ یگذارد و جاندار را و گر نیاد راستی و جہانیاں را پس بہ دادزدی نیاز دارد. آں تاجور افروزہ افرۂ ایزدی کہ با بخشش کام نگرد و در راہ دانش دواد دہد. در آزردن دل آزارم (شرم) نداشت و در برد زد تکیب، در کشتن خلق پروا.

تو پارسا طلبی عاشق و من آں رندم | کہ نے بحلقۂ او باش آشکار کشند

پایان کار لشکریانش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جواں میر فد آگیر را با ہر چہار پسرش گرفتہ آوردند و بخداوندگار سپردند. وا دلے بزرگ زمانے را آہنگ عاجز کشی نہ بود و خوں گرمی پاداش (یعنی جوشِ انتقام) نداشت می خواست. تا بخشودنی بخشود و گناہاں تا بخشیدنی بخشیدن از نہاد اہل بزم خروشی برخاست خاصہ شاہ محمد مرزبان بدخشاں، و شیخ محمد بیاں ملدوز و امیر کیخسرو کہ دیشاں نو دنا سور ہاے کہن داشتند زخم تیز تر زدند، و بزاد ہاے خونچکاں. خونانہ فشاں فغاں بر آوردند کہ با قصاص خوں ہاے ریختہ ہی خواہیم و انتقام فتنہ ہاے انگیختہ کہ والی ولایت آں زابل تواند کرد. ناگزیر بدیں. گفتار فرجام گیرو داد بشرع حوالت رفت کارآگاہاں و دانش پناہاں خوں ریختن فرمودند. و سادات و علما بہ کشتن فتوی دادند.

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد و دل اندیشہ باشد کہ خود را بگریختن از ہنگامہ بدر برد و بس وزادیہ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد. از انجا کہ سلاح و سلب نداشت سراسیمہ از جا رفت و آخرگاہ بدر آمدہ. بجنگ سیلی و مشت رہ گریز پیش گرفت. خون خواہاں بخوں گرمی در وے آویختند، و خویش را کہ بدلیلاں گرم شدہ بود گرما گرم بہ زمیں درریختند.

تو اے ندیم کہ مانی نہ تازہ رو دی خویش | بسبزۂ کہ سر از طرف جوئبار کشد
فریب مہر گردوں مخور کہ ایں بے مہر | دمے فشار کسی را کہ در کنار کشد
ہواے تاج شہی ہر کرا بود در سر | سرے بمرفق شاہان تاجدار کشد

احوال ہمایوں و شیر شاہ

شیر خاں را دل دگر بود و زباں رنگ. بہ لابہ گری و فسوں گستری پیام آشتی درمیاں داشت تا چناں شد کہ ہیچکس را ستیزہ در اندیشہ نگذاشتہ از آں گل دیلے کہ در راہ پیمودہ بودند، در ورود شب از رہ ہردی نسے از فشاردگی تیاسودہ بودند، پیادہ آزردہ پاے بود و سوار فرسودہ اندام و ستور پشت ریش. فریب دوستی از دشمن خوردگاں (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراج غنیم کشیدند و دم آسائش غنیمت شمردند. پا پیما بہ جادہ ز دامن آشنا شد. (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) دیکھو پاچوں صورت ربا بستر بہ نہ پذیرفت. سر از بالش نخیزد تا کلاہ و مغفر را چہ کنند، و پیراہن حریر بر تن گراں ست تا چلقہ و جوشن کجا بند ہوا نناک بود. و ابر دشمہ فشاں، تیغ در نیام زنگ بست و نمد زیں بر بارہ گی گراں گشت. سپیدہ دمے کہ تیرگی تار میغ جہاں را فرا گرفتہ بود ہنگامہ سازاں ہنگام جوئے یکسرہ بر غنودگاں ریختند. شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفہ بزاہستہ ــــ در لشکر افتادہ کلاہ از کمر و پا. وم از اضطرار فشا خفتہ از رخت خواب جستہ بے زیں نشستہ، پراگندہ ہر طرف تاختند گرد ہے. تہر چہا دا با دگویاں سوارہ خود را بدریا زدند. و بہتر و نے چند سال جویاں بہ شناوری دست و پا زدند. تا کہ لناں بزخم و ہم تیغ و کداماں بہ خشم موج اندر مردہ باشند، و کداماں از طوفان ایں دو آب (یعنی آبِ تیغ و آبِ رود) جاں بسلامت بردہ باشند شہنشاہ جہاں گیر (ہمایوں)، نہنگ دشت نورد و دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فراز ساحل در آب افگند. پاے از رکاب، و عناں از دست و اسپ از خم ران بدر رفت و شاہ سوارے کہ شاہان ہنگام سواری بوسہ بر رکابش می زدند غوطہ در آب خورد و نظام نام آزادہ از آب کشاں لشکر کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم برراہ و گوش بصدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد منتظر عروج و اقبال او بود) و با خویشتن ایں اندیشہ کہ از ساحل چوں گذر و بہ ساحل جا داشت ہوا خواہانہ بداں چستی کہ گوئی گوے دولت برد خود را بآب درزد بارے بداں سنت آشکارا جتیاں سقاے سخت کمشے بود در بہ والا دید معنی آشنایاں فرخ سروشے بود کہ جہانیاں را از گرداب بدر آورد و بر جہانیاں منت نہاد.

ازو دستنبو

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی لفظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبو میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے. التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے. باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبو میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا. چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبو کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں.

دریں روزگار، کہ ہر زمزمہ را ہنجار و ہر چہ را رفتار و ہر کجا سپاہے بود از بیمہ را سخن ہمی بگذارد بگوے کہ خود روز و روزگار برگشت اختر شناسان پسرو بہاے (یعنی منجماں) بر آنند کہ در آں روزگار کہ بزم تاریز وجود شہریار پارس کہ از نہ کتازیاں (اہل عرب) بہم خوردہ کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برج سرطان) انجمن آراے و بہتر آزما ہی بودند. اینک ہاں پایہ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہ (جاے قرآن) بہرام (کیواں) ست و ایں شورش و پرخاش و جنگ و خوازی و خونخواری، و رنگ و نیرنگ، نمایہ (ظہور) آنست.

وا ذ برین گفتار کے گردد؟ آں ماضین لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر، واین لشکر لشکر ست. از فر اوندان لشکر، چنانکہ از داستان باستان پارسیان پارس بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو ستیزندہ آویزہ جدائی تو دارد. در آں بار کہ سخن در کیش بود، ایران ویراں بر فرّۂ فرہنگ کیش نو یعنی (اسلام) فرجام آبادی، وا ز بند آزر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت. ودر ایں بار کہ گفتار در آئین ست، ہندیاں بہ چشم داشت کدام آئین تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں ہم از آتش تافتند و بسوے فراراہ یافتند. ہندیاں دامن دادگراں (یعنی اہل فرہنگ) از دست دادند و بشکنجہ داد بہمی رواں (درندگاں) افتادند. نمی بینی کہ از دامن تا دام وا زداد تا دد گہ مایہ دوری ست، ودار آنست کہ آرامش (راحت) جز در آئین انگریز چشم داشتن کوری ست. زخم تازیانہ تازیاں از خوبی آں کیش فرخ (اسلام) مرہمی داشت روز گار در نوردایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت باز اندوہ اندوہش در بہاے نشزند (پریشان وتباہ) بری داشت. اگر در اندیشۂ داندانان بہ ہر دانش وداد از ایں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست بس نشان و ہند و برون اندو مگیں بیناک سپاس نہند، جہانیاں با جہانباناں ستیزند، ولشکریاں خون لشکر آرائیاں نریزند وانگاہ شادی ورزند و بر خوشتین نہ لرزند. ہاں اے دانندگان فرزانہ بود حکمت الہی، وشناسندگان زیاں و سود ایں ہنگامہ آتش خشم فراوند گرم ست ورنہ کارزار پارسی ایں چنیں امید سوز و آرزو گداز نہ بود۔

• چاشتگاہ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ یازدہم مئی سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت انگرفت در و دیوار بارہ و بارہ دہلی بجنبید وآں جنبش زمیں را فرا گرفت. بسخن ورزمیں لرز (زلزلہ) نمی ورد، در آں روز جہاں سوز بخت برگشتہ و سرگشتۂ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بشہر در آمدند ہمہ بے آزرم و شور انگیز و بخداوند کشی تشنہ بخون انگریز دیدبانان دروازہ ہائے شہر کر بردن (علاوہ) از ہم گوہری وہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ ہم از پیش ہم سوگند نیز باشند بہم پاس نمک وہم پاس شہر گذاشتند و مہمانان ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند. آں سواراں سرگراں تیز جو (بیک عناں) وپیادگان تند خوے تیز رو چوں دیدند دربانان را مہمان نواز یافتند، دیوانہ وار ہر سو شتافتند و ہر کجا از فرماندہی و ہر کجا آرامشگاہ آں جہاں، یافتند تا از کشتند و پاک نہ سوختند روی از آں سوی بر نتافتند. مشتے گدایاں گوشہ گیر، از بخشش انگریزی توشہ گیر کہ نان تر و دروغ می خوردند و در شہر دور از یک دگر پراگندہ جا بجا روزگار بسر می بردند (یعنی رعایائے شہر) ہمہ تیر از تیر ناشناسندگان نہ پلاد کے در دست، ونہ خدنگے در شست. اگر راست پرسی ایں مردم بہر آبادی کوے و برزن اند و براے آنکہ بہ آہنگ پیکار دامن بہ کمر زنند بایں ہمہ از اں رو کہ راہ آب تیز رو بہ خاشاک نتواں بست، دست از چارہ کوتاہ دید ہر یکے در سرا خویش ماتم نشست. یکے از اں ماتم زدگاں منم کہ در خانہ خویش بودم، چوں غریو و غوغا شنودم تا از پژوہش دم فرو دم، و دراں مایہ درنگ کہ مژہ بہم زدم.

آوازۂ کشتن غلیظن صاحب ایجنٹ بہادر و قلعدار در ارگ (قلعہ) در دید سواراں و پیادے رسیدن پیادگاں در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار بلند گشت ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندا ماں ارغواں زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانا بدخمر نو بہار نشد. ہاے آں جہاں داراں داد آموز

دانش اندوز نکو خوے نکو نام وآہ از اں خاتونان پری چہرۂ نازک اندام با رخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام، و دریغ آں کودکاں جہاں نادیدہ، کہ در شگفتگی بر لالہ و گل می خندیدند، و در خوش خرامی بر کبک و تذرو آہو می گرفتند کہ ہمہ یکبار بگرداب خوں فرو رفتند اگر مرگ بہ بالین ایں کشتگان بمویہ (بگریہ) نخروشد، و در ایں سوگ سیاہ پوشد رواست، واگر سپہر خاک گرد و فرو ریزد و زمین سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد بجاست.

ای نو بہار چوں تن بسمل بخوں بغلط اے روزگار چوں شب بے مہ تار شو
اے آفتاب روی بہ سیلی کبود کن اے ماہتاب داغ دل روزگار شو

باے چو آں روز تیرہ بشام رسید گیتی تاریک تر گردید، سپہ دوناں بخوکش (بخیرگی کشندہ) ہم در شہر جا بجا رخت تن آساں انداختند و ہم در ارگ باغ خسروی وآخور اسپان و نشیمن شاہی را خوابگاہ خویش ساختند. رفتہ رفتہ از شہرہاے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگان ہر سپاہ از ہر فرود آمدن گاہ (منزل) خون سپہداراں ریختہ اند. گروہا گروہ را از سپاہی و کشاورز دل یکے گشت، و ہمپے آنکہ باہم سخن بودہ و دز دیک یکدست بر یک کار کمر بستند، وانگاہ چناں پندارد کمرے وچگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبش جوش غونے کہ از کمر گند و کشادن پذیرد پندار ایں لشکر. دستہ بے مرد جنگ جویان بے شمار را جاروب داد کمر بندی ست آرے زفت در دب ہند و بوم بداں سال کہ آرامش و آسائش اگر چہ پند باندازہ ہر کاہے گاہے نیابند ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمی خواست ایک ہزار لشکر نجگری ہمہ پے لشکر آراے آراستہ و بس سپاہ بینی یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ.

توپ وگلولہ و ساچمہ و جز آں بارود ہمہ از خانہ انگریز آوردہ و با گنجینہ داراں روے بستیز آوردہ آئین نبرد و رزمش پیکار ہمہ از انگریز آموختہ، و در غ کین آموزگار افروختہ. دل ست سنگ و آہن نیست چرا نسوزد چشم ست رخنہ و روزن نیست چوں نگرید؟ آرے ہم بداغ مرگ فرماندہاں باید سوخت، و ہم بر ویرانی ہندوستان باید گریست. شہرہاے بے شہر یار چہ از بندہ ہاے بے خداوند چنانکہ باغہاے بے باغباں پر از درختان نابرومند و ہنر از گیر و دار آزاد بود. بازارگاں از تمغا، خانہ ہا دیوانہ یا دکلبہ ہا (دکانہا) خوان یغما.

از دیباچۂ ثانی درفش کاویانی

غالب خاکسار ہرزہ کارم را از آسمان بہ زمین فرستادند، و فرماں دادند کہ در ایں بیشہ پیشۂ کشاورزی (کاشتکاری) ورزند وایں فرماں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندد. ناگزیر می بایست (ضرور تھا) کمر بستن و زمین خستن، رگالو راندن و دانہ افشاندن. تا دان (اکشاورزی نہ کرد بلکہ) بہوس در زمین غزل جاں کند، وا زاں گہرہا کہ با خویش آوردہ بود ہمہ داراں زمیں پراگندہ ہا نا (گویا) از ہر دانہ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت از مروارید کہ در خاک نہاں کنند. شنیدہ؟ کہ ریشۂ سر بر زند. کاش جو کاشتنے تا سود بر داشتے. والنسب کہ ہمہ را خاک خورد، (یعنی تلف شد ناچار) ہمہ و دیگر راہ پیش نخاہاں روزگار بسر رید مدو لپسندیدہ بخرید نہ شبہ یا بیکے. زد انا زاناں بپژوہش (پرسش) رفت کہ در مبدا فیاض بخل نیست، ابر بہ باغ و راغ و دمن و در من یکساں بارد، چو لے کہ مردم چندے نادارداند (یعنی یکسانست) جداشناس (مابالامتیاز) اگر ہست

جز ایں نیست کہ کار، بادگردے ہے. زہر یک بریک ورق سوز و سازِ جز گرمی گرد سیم از ہر کس بریک صفحہ نوشتہ اند. آں ہاں ورق از دفتر باخویش آوردند برات روزی از ہر ورہ کہ مقدر بود بگیرند ایشاں ازاں رو کہ انفکاک صفحہ از ورق صورت نہ بست ہتی دست آمدند و ہتی کیسہ زیستند گفتم از چیست؟ کہ در چار سوے دہر ہیچ

بجنت صلۂ مدح و قبول غزلم نیست

گفت آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چک)، بیاوردہ و ایں از الست بجنا بے بلند داری، و بہ تماشا سازماں (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی گفتم چہ گفتم نا زاندہ باز رہم؟ گفت شکیب ورز و خوں گری، و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدہ ای گوے

کس زبان مرا نمی فہمد　　　بعزیزاں چہ التماس کنم

تلقان دارین اغلاط برہان قاطع سپاس می خواست نہ ستیز در قلمرو ہند کس نماندہ باشد کہ مرا بدیں نیکی بدخواندہ باشد بے خبر آورد کہ من قاطع بے قاطع برہان دگرے انگیزد آورد کہ من محرق آنم. کیست تا از من بداں جواں مرداں گوید کہ از وردیدن و سوختن کار خدا جز فغاں و دخاں چہ خیزد" بزہ مند (گناہگار) منم، اگر در آتش نگنند و دبہ تیغ دو نیم نزنند بہر دو گزندہ، خود سزتم (یعنی لائق ہستم) و بہر دو سرا سزا داد.

سخنداں راستی جوے را بایستے آنکہ از ہر کتاب فرہنگ عبارت جامع آں داندان نگاہ تیز نگرد کہ از بس تیزی در جوہر لفظ فرو رود تا چگونگی پیوند الفاظ کہ انگیزش گاہ معنی ست آشکار شود ہرگاہ آں را ہنجار اہل زبان نہ بیند داند کہ در سوداے زباندانی جز زیاں نہ بیند.

دیگراں دانند و کار آناں، مرا نیز خردے در و لفے دادہ اند. فرسائی را آفرو (پیش آوردہ) از لغتِ بیگانگاں را چوں پذیرم؟ و از نیروے خود خداداد کار چوں نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیز و خرامے دانش من دانشمند کسی ست کہ اگر چنانکہ راز داں بود. راز گوے نیز بودے ششمیں ساماں بہ شمار آمدے.

نہ خویشاں بہ بیگانگی شاد مانم　　　نمانم بکس چوں بکس مے نمانم
حزیمم و لے در فشاں عزیزاں　　　چنار سرا فراز ورد بوستانم
گر فستم کہ از تخم افراسیابم　　　نہ فتم کہ از نسل سلجوقیانم؟
دل و دست تیغ آزمائی ندادم　　　رہ رسم کشور رہستائی ندانم
بہ میداں معنی حسد او نہ رنجتم　　　بہ عقشادر پہلو زباں پہلوانم
دو سی سال توقیع معنی نوشتم　　　سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطع برہان کہ صنعت نقشبندِ خیال من ست، نہ نامۂ اعمال من ست کہ در آں جہاں بمن خواہند سپرد. ہم دریں جہاں خواہد ماند. در دل فرود آمد کہ بجاے چند کلاے چند بفرازیم و ایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام پس درفش کاویانی خطاب دہم.

نازم بہ خرام کلک و طرز رقمش　　　مانا ست ز تیزی بدم تیغ دمش
چوں اسم کتاب قاطع برہاں بود　　　گردیدہ درفش کاویانی نامش

حاشا کہ رو بہیچ حق از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم سرودن سخنہاے دیدہ و استغفار، جز افزودن جوش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد یاراں جفا کنند و من بہ ازاے ہر جفا (بعوض ہر جفا)، وفا ورزم بہا نگوئی و بہر سنگ زنند گہر بارم.

از تقریظات و دیباچہ ہا

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں. ان میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے شاعری کا عنصر نظم کے مراتب غالب تر پایا جاتا ہے. ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں فقروں اور ان کے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر جگہ صفات متوالیہ و متتابعہ لایا کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں. پس سوا اس کے کہ یہ نثر میں شعر کے اوزان مخصوص سے، جن کو اس کی ماہیت میں کچھ دخل نہیں، معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے ان پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے.

چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاص کر اپنے عالی دماغ نکتہ سنج معاصرین کی ضیافت طبع کے لیے لکھی ہیں اور ان میں اپنی نو آئین طرازی اور نادرہ دستی کا جیسا کہ چاہیے. حق ادا کیا ہے. اس لیے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرہ کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائے گا. جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا. لہٰذا ان نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائے گا. جس سے مرزا کی ان جو یلی اور عمدہ انشا یہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے.

اس غرض کے لیے ہم اول بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں. مثلاً کتاب پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں اس کے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے.

وہاں ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں، "زمینے شور کہ چوں ذوق مے در طینت زاید جز گلبن را دو آنجز ریشہ خاک نزوود. و خاکے نا استوار کہ ہر دیوار کہ درواں ریختند بہ گشتنہ پیش از سایہ خود بخاک افتند."

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ دیوان مذکور اور اس کے نوادر افکار میں آورد اور تصنع یا کسی استاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے. اس طرح ادا کرتے ہیں" بنا نیر ودیعی چشم بدور تحقیق نقابے ست از روے شاہد ہر سخنے گردہ معنی بجنبش نسیم بر افتادہ، یعنی نگ کش کش دست ناکشیدہ. بازپسیں چراغیست از گرامی چراغاں نیم سوختہ پہلو رخ بافروختن دادہ یعنی داغ منت خس ناد یدہ."

ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اس کے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا. اس طرح بیان کرتے ہیں" سخن آفریں خداے گیتی آراے را ستایم کہ تا منا نخانہ ضمیر را از فراوانی رنگارنگ معنی بہ لعل و گہر انباشتہ بازوے دارائی ذی مرجاں سنجی و خامہ را ہنگامہ گہر پاشی ارزانی داشت." اب ہم کچھ عبارتیں دیباچوں اور

نثر نبلوں سے انتخاب کرکے ہدیہ ناظرین باتمکین کرتے ہیں۔

دیوان فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو، کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھ کر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "اے غم میخانہ سرمدی نسبت، چشیدگاں سگالند کہ ہیچدانی را ایں مایہ سیرابی نطق از کجا است، غافل کہ تخم و شخم یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن و نہال را سر کشیدن، و میوہ را رسیدن و لب را از زمزمہ آفریدن آموخت، و بہ پرتو ہماں ازلی ہدایت شبگیر گردگاں اندیشند کہ تیرہ سرا نجانے را ایں ہمہ روشنائی گفتار چراست، بےخبر کہ فرہ آسایش یک نور ست کہ شمع را بشعلہ، و قدح را بہ بادہ و گل را بہ رنگ و دم را بسخن برافروخت۔

داغم از کوتہ نظراں تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاہ و درخشیدن برق بہ شبہائے سیاہ شگفت ندارند و جنبیدن زبانہائے گویا بہ سخن ہائے نغز و شیوا انگارند غنچہ شگفتن نفس است، و بادہ غالیہ سائے، و گل کشادہ و جبل نواسنج، زباں پرگارکدہ است کہ سخن سرائے بنا شد مہر جلوہ برتابد و ذرہ بے تابی، و بحر روانی، و قطرہ تبسم، دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید۔ ہمانا بدانست ایں گروہ کہ بادہ در خمخانہ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفان گذشتہ را تردماغ ساختہ، حالیا بساط بزم سخن برچیدہ و جام و سبو بر سر ہم شکستہ و از آں قلزم رواق نمے بر جائے نماندہ، پندارند کاش باتجنے کہ من در فروردین رود (یعنی صحت پاش) بحلقہ اوباش قدح می گیرم۔ فرادسند تا دادرسند کہ مے فراوان ست، و ساقی بیدریغ بخش، و پیمانہ ہا جرعہ ریز ست و لبہائے العطش گوئے۔ ولله در من قال۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست — مے و میخانہ با مہر و نشان ست

اگر اے صہبائے سخن بہ روزگار من از کہنگی تند و پر زور ست، و شب اندیشہ را بہ فروغ میدن سپیدہ سحری برات فراوانی نور ست۔ ہر آئینہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند، و من خراب ستم، ہیچیاں چراغاں بودہ اند و من آفتابم۔

اس کے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کرکے اسطرح لکھتے ہیں۔ "انصاف بالائے طاعت ست۔ در ہوائے کہ یال بالاخوانی، (یعنی خودستائی) دہ ام و در ادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام نیز از آں شاہ بازاری ست۔ یعنی بہ پستی دیگر توانگرستائی یعنی بدخوانی۔ بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ غمے از زلف مرغولہ مویاں کشودہ شود بادو من آویزد، تا دل نہ پیچاک آں خم کن بندمے و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے براورنگ سروری کج نشیند۔ ہوس مرا بر بیخرد تا بہ پیشیش بندہ وار راست ایستے۔ شادم از آزادی کہ لباس سخن بہ ہنجار عشق بازاں گداز دستم، و داغم از آزمندی کہ در رقیب چند بگردار دنیا طلباں ہمد مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمرے بسیر لغتے بجامہ و چنگ سر آمد و بارہ بہ دروغ و دریغ رفت۔ فرجام گراں خوابی برنخاست، و آشوب ہوسناکی فرو نشست۔

خاتمہ دیوان فارسی

خاتمہ دیوان فارسی میں اس بات کا عذر، کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اس کے چھپوانے کی نوبت پہنچی اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سر اور بلند پرواز تھی اس کی روک تھام میں بہت سا زمانہ گذر گیا اور اس مطلب کو اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

"ہاں فراں ریختنے بداں توسنی کہ عنانش بوے و مشامش بوے بر نتافتے۔ و از شوخی و سرکشی، گام جز در ازی نہادہ جز بہ پیمانہ نتافتے از ترسندہ دل عنانش کشیدہ و بہ بالا آوازی بوس انش آرمیدہ داشتے۔ چوں پارہ از راہ بہ پیمودہ، کہ بہ غمزدم و بریدہ شد، و روز بلند گشت، و ہم جوش تندی توسن فرونشست، و ہم دست و پائے سوار از عناں و رکاب خستگی پذیر آمد، تاب مہر خیرہ مغز و سر سوار گداخت و نفتگی ریگ بیاباں نعل و پائے تکاور نرم کرد۔ راکب راہ رفتہ را قدم بجز آرام آمد و ہم آں بہ آخر گرائیدہ و ہم ایں را بہ بستر ــــ نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سر آمد، و در ہنگام گستہ دمی خستگی روی آورد۔

کیست تا از من بپرسد؟ اگر ناپرسیدہ گویم در دلیش فرود آید کہ در پیری سعی ہمت را بانظارت چہ آویزشہا (یعنی جنگہا) روی دادہ و پس از انکہ کار بدانجا رسید کہ ہمدگر از کوفتگی فرو ماندہ بیاگی گری توفیق بکدام قرار داد آشتی اتفاق افتادہ خامہ دیر جنبش بود، و شوق زود گرائے (جلد باز) گفتار از نہیب درد یاد شہ اندیشہ بدر از نامے فاصلہ دل و زباں خوں شد، و اگر ناگاہ از دل بہ زباں رسید، و الانیستی ہمت آنرا انجام نہ بپرو۔ ہرچند منش (طبیعت) کہ یزدانی مردش ست در سرآغاز نیز گزیدہ گوئے و پسندیدہ جوئے بود، اما پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادی) پے جادہ نشناساں بر داختے، و گشتی رفتار آناں را بنغزش مستانہ انگاشتے تا ہمدراں نگاپو پیش خراماں را بخجستگی از نش ہمقدمی (یعنی لیاقت ہمراہی خویش) کہ در من یافتند۔ مہر بجنبید و دل از آزرم (مروت) بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہائے من خوردند، و آموزگارانہ در من نگرستند شیخ علی حزیں بخندہ زیر لبی بے راہہ رویہائے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے نارواہ را در پائے رہ پیمائے من بسوخت ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس (تاثیر کلام) حرزے بہ بازوئے و توشہ بہ کمربست و نظیری لاابالی خرام بہنجار خاصہ خودم بچالش (رفتار) آورد۔"

از دیباچہ دیوان ریختہ

دیوان ریختہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاط قوی اور اپنے قلب ماہیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں "ہاں اے غالب تیرہ روزہ ژم اختر! کہ بدیں ہستی و کسالت (تخفیف) کہ تراست، بداں ماں کہ روانی در عالم فرض محال پسندے دیدہ ایم بہ آتش آرمیدہ۔ الله الله چہ مایہ جوش سوداست (یعنی غلبہ مادہ سودا) کہ سر نفیلہ کی کش چوں خطے کہ از نقطہ برآید بہ ہر رنگ سویداست۔ آں قلم و اندیشہ کہ از روانی خامہ روانی گفتار آب و ہوا داشت، و آں ہش نافرو دین پرستاری، و چاشنی ہش را نسیم سحری پیشکار بدیں ناخوشی و نشر مندی دیراں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دست تماشائیاں ببرد، و غنچہ را چہ روی داد کہ بہ دمیدن پردہ شکیب نظارگیاں ندرد۔

آں اثر پردہ سازت چہ شد — زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں زجنوں پردہ کشائیت کو — واں نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتم) کہ سوز غم و دود از دل بر آوردہ گداز نفس آذر جو زباں زد بادے کہ ہر آئینہ نہ گداخت، و بادزبانے کہ ہمانا نسوخت، غدر غم دگی مسموع نیست بیا تا ہمیں دل بد زہرہ الحمد نوائے زا بہ سخن ہنیم و ہمیں زبان کشر کشم این المعز سر لیسے را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظ دیوان ریختہ بر نگاریم)

ز من جز ہمہ درد نکو زیستن — جگر خوردن و تازہ رو زیستن

سخن چیدن و دورہ انداختن　　دل افشردن و در چاہ انداختن.

(مراد از سخن چیدن و دورہ انداختن آنکہ بہ یگاں اظہار خوشحالی می کنم و اندروں داغ را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بہ ہیچکس ظاہر نہ شود)

روان کردن از چشم ہموارہ خوں　　بہ شوراب شستن ز رخسارہ خوں
شگفتن ز داغے کہ بر دل بود　　نہفتن شرارے کہ در دل بود

ستایش سخن چشم بد دور. حملۂ سخن را شرابے ست پرزور کہ زمیں ازاں بہ لاے (یعنی بد دورے) و سپہر ازاں بہ بوے آں چناں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرو افتد، شگفت نہ نماید.

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصہ ان کے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں. اسی لیے ہم اس حصہ میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کریں گے اور جہاں ممکن ہو سکے گا، مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائے گا. اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے گا.

مرزا علی بخش خاں فیروزپور جھرکہ میں ہیں، نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کی جگہ شمس الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں. مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتہ پہونچکر خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

"میر فضل مولے خاں نام یارے داشتم، او را ناگرفت (ناگاہ) در عرق وبا بہ مرشد آباد یافتم در نوردِ گفتگوہائے دیرس جو ہائے کہ رفت. از جا بہ گذاشتن (یعنی اندرون) فخر الدولہ بہادر ہمیں خبر داد، و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں برگفتند آوخ! کہ چراغ روشن ایں دودمان نے مرد و شبستاں آرزو ہا تیرہ و تار شد. از جانب شما اندیشا کم دارم کہ انچہ شمارا پیش آید دلخواہ نباشد. ناکساں را دو زبانہ خواہ بود و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ. ندد اگر انجمن از ہم پاشد، و پراگندہ چند گرد آیند. دولت روی گرداند، و آسودگی برخیزد. زنہار ہوشمندی را کار باید بست و ہموارہ بخود نگراں باید بود."

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں.

سبحان برادر! سخن را از فزائی بر وے ہم آغاز ست دگرہ در گرہ گردیدن و من آں می خواہم کہ اندک گویم و سود بسیار دہد، و شنوندہ آں را از دور باید. وایں بہیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ بجنبش از گفتن آں مایہ رود تر نہ رود کہ سراپا ہر دو رشتہ باہم گرفتوان تافت، بہ نقش یکے در آئینہ دیگرے نتواں یافت. زمانے گوش بمن دار بہ سید و فرار سید کہ چہ می گویم، و ازیں گفتن چہ می خواہم، و شمار او بہ ابر آں چہ می باید کرد، و اندازۂ آں بایست تا کجاست."

اس کے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیے ہیں.

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسۂ اکبر آباد جو مرزا کے ہموطن ہیں اور انہوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے. ان کے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں.

امروز شرارۂ بداغم زدہ اند　　نشتر بہ رگ صبر و فراغم زدہ اند
از کثرت شور عطسہ مغزم ریش ست　　تا غلطہ بہ عطر در دماغم زدہ اند

جنبش خامۂ عیسوی ہنگامۂ مطالع کرتم مخدوم المعظم را تازہ کرد یا حیاے ہوس ہائے مردہ ساخت خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازار تیزیٔ گرم کرد خار خار دیریں آرزو ہا سر از دل بدر آورد. بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی نسخے راز جبرباناں انجمنے بودہ است. چوں خفتۂ پرسش بعزم اندیشہ فرو بردہ از آئینے احوال پرسیدہ اند، خونچکانی نوا ہا تماشا کردنی ست. دسازی زمن فراق کہ مجمع مخدوم شانزدہ سال است و بداں است نامہ نگار سہ از لبت سال بیست سر تیز کرنے بودہ است کہ نقش آسائش از صفحۂ خاطر بداں سترده اند. آغاز دردو بہ بلی کردو بادہ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی بقیۂ ہوا و ہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودن جادۂ کامرانی ہوس گذشت و بے راہہ فرا میدہ شد. تا سراز مستی بگردید (یعنی بدمستی سے پھر گیا) دامن داں بے خودی پاے معطلہ پیما بہ گوے فرو رفت. (گڑھے میں اتر گیا. یعنے ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم و ہم شکستہ سراپاے وگرداندہ سرودرے، برخاستم. ہنگامۂ دیوانگی براد ریکطرف، و غوغاے دام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب، و نگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشن در نظر تیرہ و تار شد. بایسے از سخن دوختہ و چشمے از خویش فرو بستہ جان جہاں خستگی و عالم عالم خستگی، با خود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ پر دم تیغ نالاں بکلکتہ رسیدم فرماں دہاں سر برزی دکو ہلدتی (یعنی مہربانی نہ) شگفت، کردند و دل را بہ پردہ بخشیدند آں جہ بخشایش کو مشاہدہ رفت، امید کش آورد، و ذوق آوارگی و ہواے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود، بدل نماند و ہوس آتشکدہ ہائے یزد و میخانہ ہائے شیراز کہ دل را بسوے خود کشاد مرا بہا. ہوسہا، از ضمیر بدر جست (یعنی بمشاہدۂ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال در آں بقعہ مجاور بودم، چوں گردونہ جزبل آہنگ ہندوستاں گرد، پیش دو پدم و بہ دہلی رسیدم، روزگار برگشت، و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت. اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام، و در آمیزش بردی بیگانہ و آشنا بہ من اگر بائے نیم رنگ و اندوہ، کہ پارہ لزاں بار گفتم. در نگارش نامہ و پارش پیام کاہل قلم و کوتاہ دم باشم، و بزرگان وطن بیاد نیاوردم، در عالم انصاف پیرو نیستم. اما گر استانگاں جہان مہر و وفا کہ از دور افتادگاں بپرسند و از مرگ و حیات دوستاں باز بجویند اگر گفتگو بمیاں آید و سند شکوہ عتاب برعتاں (یعنی بمتاب یکدگر) تا ذو گوے دعوی بچوگاں نخواہند برد و قطع نظر از حریف آب رفتاں. (یعنی حریف مغلوب) کہ منم. خدائے توانا را چہ جواب خواہند داد."

کس از اہل وطن غمخوار من نیست　　مرا در دہر پنداری وطن نیست

مولوی نور الحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتہ سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اس کے ساتھ نثر کا ایک مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے. اس کے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں.

"پدید آمد کہ خاطر خاطر را بجانب نثر گر لیتے، و ہنگامہ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرایشی ہست. بادے ہم دل بر سینہ دیدہ شعلے نہادہ آید، وہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید. دم سردی شما (یعنی کم شوخی شما) بدانش آموزی، انچہ دیدہ روز (یعنی در روزانہ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام یاد می کنم، و خون گری

(یعنی سرگرمی شما) در خود اندر رای آنچہ امروز می نگرم خود را بدیں شادی کنم. ہمانا در اندیشہ ہائے برگزیدہ ام بداں ذوری کہ ثمر از شاخ افتد نکلے شدہ، و در طب باد آوردہ سنے نہ بہ ہنگامۂ یوسفی در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید از بند حجاب بدر آمدہ، و ہر ہفت کردہ خواست آید کہ مسودۂ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں نگارستہ بادنشست ہر کرشمہ انگیز ہر برگ لہ را بپیاپیستگی آراستہ بشما فرستم. صاحب من! اگر خدا نشاید کہ گفتار چند بگفتار سرہ نہ گردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود ہر چند ارادت شما ذریعۂ سعادت من و خرسندی شما موجب ارجمندی من ست. لیکن تحریر و میاں نگنجد و بہ میانجی گری خامہ کار بر نیاید. آرے نگارش کیدست ست و گفتار لخت لخت. سترون یک لفظ از میانہ، و آوردن لفظ دیگر بجائے آں آبرو نشانہ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرسش و جواب و در حق ایں پرسش تواں گذارد و گر بہ ہمزبانی. و دریں روزگار یکے از برادراں، کہ در برادراں از وے عزیز ترے نیست. سخنہائے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثر ست گرد آوردہ و صورت سفینہ دادہ است. زیں پس آں مجموعۂ پریشانی را پیش شما می فرستم تا دستمایۂ سگالش در سخن و بازنمائندہ اندازہ بکوی فن تواند بود۔

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے (جبکہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں ان کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے. اپنے نتائج افکار میں سے کچھ ان کو بھیجا ہے. اور ان سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے. مرزا نے اس کے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں:۔

"متاع کالائم در کشادہ بود، و در نگ... رنگ متاع سخن بروے ہم نہادہ کس مانند مشتریان حلقہ بر در نزد، و سودائے خریداری از ہیچ دل سر بر نزد. چوں دکان و کالا، و زبان را حرفہائے جگر آزار (یعنی آلودہ بخون جگر) نماند. روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفیٰ خاں) پدید آورد کہ نقد رائج سخن خود را بہ بہائے گفتار نا سرۂ من می دہد) و گوہر را بہ پارۂ سفالی خزف می نہد.

ہاں وہاں اے خریدار دکان بے رونق! از فراوانی مسرت ورود مسعود ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا با آنکہ نکوئی ستوار خویشم، در من بہ دستک آوردہ و مصلحۂ مرا کہ جز سودۂ غمہائے دہر م گنجائی آیں مایۂ شادی کو؟ و اندیشہ مرا کہ دل شکستۂ روزہاش ماراندم. فرجام پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا؟ ___ نگارندہ اقوال خویش جگر پیچاں گیرے کہ ایں چنیں شادی را بجز در پذیرے دہ دست قدر ناشناس پندارے کہ از شما ایں قدر ستائش درباد ستایش بادر دے بے جا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبان شیوہ بیاناں (یعنی فصحا) و در خوار تر از آں ست اندازہ فنائی باندازہ داناں.

قبلہ مرد چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بہ پوزش فرزنداں رائے افتادم (یعنی مجموعۂ کلام فارسی) اکنوں آہم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست گوئی پس از سفتن آں گنج گنجدان رفتہ واز سخن ہر چہ ازل آوردہ من بود گفتہ شد..."

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشن بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے. اس کو دیکھ کر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے "من کہ نامم درستائش بیقرار است و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ امید کہ دراں بایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نشوم. و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم. بنامیزد (چشم بد دور) تذکرۂ تو کتاب بلاغت

مجموعہ فراہم آمد کہ پیش طاق بلند نامی را نقش و نگار است، و نہال نکو سرانجامی را برگ و بار و ہر در نکر چوں بہ پیدائے کنارہ ناپیدائے ذوق سخن گام تماشا بہ دارد. توشہ برایں بر کمر نتواند بست. خضر با آں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت. عیش بر تہ آبے تر نتوانست کرد. و آں آب از دریا بجنبیدن بود. شما گروہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانی جاوید بخشید بدایں نکتہ از عمر بکار دیگراں کردن ست. جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندہ جاوید شدند. دہگاں یکوئی تمام برآمد. بارے گہر بسفتن خامہ گوہر ریز نگشتن نامہ در ردیف الف بہ نگارش اشعار پردیں شاد حضرت آزردہ از چہ روست؟ ہر چند دگر ندانم بر چنیں مقام درجہ بدۂ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضائے فرط محبت جرأتے بکار می رفت گناہے نہ بود، در تلافی آں بہ پوزش (معذرت) نیاز می ___ افتاد."

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جبکہ وہ کلکتہ میں مقیم ہی خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجئے. اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:۔

"دردمند نوازا! نسیم ورود دلکش رقم نامہ غنچہ ایں راز وا پردہ کشائے و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگار بہ گزلک تطاول زبان فراق نقش بے اعتباری ہائے مرا از یاد عزیزاں سترہ است.

در معرض طلب نثر فرد ماندہ تر از اں میزبان بے دستگاہم کہ ناگہ فت (اچانک) مہمانے عزیز ش از راہ دور در رسد، و بے چارہ لب بگزد و سراپائے سرمایہ خویشتن نگر دد. تا شوربائے دود پختے و نان کشکینے (یعنی نان جویں) فراز آرد. من والیان من کو بگرد آوردن نثر پراگندہ نپرداختہ و خود را دریں کشاکش نینداختہ ام. چہ پیدا است کہ فرد وینۂ سلک ایں کس (یعنی من) نقشے ست نثر ما (یعنی زشت) یا رحمی ست فرہمند (یعنی خوب) در صورت اول چہ لازم ست خود را بہیچ فروختن و وبال نظارہ آئینہ گوں بہ سم خریدن، و در شق ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگاں چہ بردہ اند گذشتگاں چہ پذیرفتہ کہ ما را از روئے آں دایہ (یعنی ریزہ) بیتاب دارد. الحاق بالائے طاعت است بہ خوی گاہے کہ توانائی سخن و العزر بمید گی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی روش مسلم داشتہ) دلوائے قرۃ العین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی طرز برافراشتہ باشند) باکہ باید گفت کہ نتائج طبع ما کجائی ست، و ما را چہ لذت دریں جگر خالی ست سطرے چند کہ بہ دیباچۂ دیوان ریختہ کسوت حرف در قم پوشیدہ، در دو ہر دلے کہ بہ آرائش سفید موسوم بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان بیجمیم دار از شرم تنک مائگی آب می گردم. والسلام."

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں: "دریں ہنگام فرو ماندگی از اندازہ گذشتہ دل بہ افسردگی خوی گرفتہ است. ندانم چہ می نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگریستن نگہ از تازگی دیدہ ور دمی گنجد، و دریں نگارش نامہ از شادی در جاں (سراگشت) می رقصد. بخت را بہ رسائی ستایم و پندارم کہ بطلوع معنی رسیدہ ام. خود را بجزاں مانگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ ید بیضا دیدہ ام. اگر محمد ریہ مرا بجز گرفتن عیار ایں دعوی حیرتے روئے دہد، در ایں مایہ بالاخوانی و خود نمائی از من عجب آید. گویم ہاں انصاف. سخن بکنایہ می سرایم نہ بگزاف. موسیٰ اشارہ بہ سیدی تکرمی میر موسیٰ جان ست، و ید بیضا عبارت از دیوان فرد عالی عنوان.

نہ بہ دیوان کہ مدادش از دودۂ چراغ طور ست، و غلافش از دیبائے مگر ہوئے قلزم معنی را سفینہ است، و جواہر مضمون را گنجینہ ......

سبحان اللہ سخن بہ روزگار مخدوم بہ پایہ بلند رسید، و بازار درا رونق دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدن نامہ من بخاطر عاطر جائے گرفت و شکوۂ آں بہ زبان قلم رفت، مرا آبرو افزود، و ارزش مرا در نظام جلوہ گر ساخت خوشا من کہ دراں چشم و دلم جائے باشد، و چوں نامۂ من نرسید آرزو دارند و گرد سرایں نوازش گردم، و دریں پرسش حال برافشانم"۔

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی تھی۔ اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

"قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال را ہوائے دیدن عشاوہ سرزنا گاہ شامگاہے بہ نشیمن تنہائی من گذر افتادے۔ آں در گرفتن آتش گرہ، اگر در والا کاشانہ و سوختن خانہ و رخت ہمسایہ گان از ہر کرانہ، و نہ رسیدن آسیب بملازمان در آں میانہ از کجا شنودمے۔ و اگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حق دوستانہ پرسش کہ شیوۂ غمخواری دلدادہ ربائی است۔ ناگزاردہ ماندے و ہم ایزدی نیائش کہ لازمہ حق شناسی و سپاسگزاری است بتقدیم نرسیدے۔ ہاں اے وفا طلبان! بیگانگان (یعنی لالہ ہیرالال) کامیاب پیام نامہ سوختہ شایاں جگر تشنۂ در شوق خامہ!!

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید نامۂ واشدۂ مہر بہ عنوان زدۂ

ہمانا سوزندۂ آذر سرگرمی شوق از بن فراگسفتہ بود کہ بیتابانہ گرد سرگردیدہ و اندراں اشتلم (شدت) زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت، ہیہات من کجا و ایں ہمہ دعوی بلند از کجا، خود نمائی ہائے گماں تاثیر مہر و فاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاے و یاوہ سرائے وادارد، و رنہ آں را کہ از شعلہ آہ جگر سوختگان دامن نسوزد عجب نیست اگر آتش افروختہ پیراہن نسوزد۔ شکوہ پیش کش و پیغارہ (طعنہ) برطرف فدائے توانا دانشگرویم کہ بلاے بے زنہار را از بندگان خویش بگرداند و تابے بھراں را دیدہ و دیدہ دراں را سر بہ دست افتد۔ کہ ترشح نیروے جبرئیل بو معجزہ آسودگی خلیل اللہ را نظارہ ہا تازہ کردہ...... اگر دانستے کہ پیش خود شرمساری نخواہم کشید، و مرا اندریں محال طلبی بر من زبان طعنہ دراز نخواہد شد۔ از آں مخدوم بہ عنایت پاسخ ایں نامہ و تفصیل ایں ہنگامہ در خواستے و پرسیدے کہ دراں ہنگام آتش زبانہ زد، و گمہ بسراغ تیرگی دودے و تابش نمودے فرارسید۔ شما چہ می کردید؟ و از چشم مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ و پس از آنکہ رستخیز دو ہنگام آشکار شد، و ہزار ہزار در انجمن افتاد۔ سراسیمگی درونی پرستاراں و بیتابی برونی ہواداراں چہ قیامت آورد؟ ایں ہمہ آشوب بچہ مایہ دیر کشید؟ و سرانجام کار کہ مژدۂ ایمنی داد و نہ، بہ کار خانہ کہ داب و بہ موبار کہاداں (یعنی اسباب ایشاں) کہ ایں ہارا جز بہ اطراف کاشانہ محل نیست و بیشتر از شما علوہ آتش بلکہ افروزینہ (ایندھن) آتش ست چہ گذشت؟ لیکن چوں ارزش التفات از من سلب کردہ، و مرا اینک در دل آرزو ہا اندر کر حالیاں دراں گوشہ خاطرم جائے نماندہ۔ ہر چہ گفتہ ام بطریق آوردست نہ بہ سبیل سوال والسلام"۔

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوق ملاقات اور غزل تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے اس کے اول اور آخر کے فقرے یہ ہیں: "سحر گاہ ہے کہ دلم از درد شانہ چنانکہ مومن جہر پیشہ از رنج ہمسایہ در آزار باشد برقرار بود، و دستم از نکتم بیتابی دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے از در درآمد و سپردن نامہ گل بہ جیب تمنا ریخت ہر چند نامہ پارس امید اکسیا، و دیدۂ جاں را توتیا آورد، تارک اقبال را افسر و پیکر آرزو را زیور بخشید، لیکن از انجا کہ آں قدسی منادمہ از شعر و غزل ہیچ نامہ اعمال زاہد از ذکرے و شاہد، سادہ بود۔ دل سودا زدہ بداں نیاسود، و خادم بداں کہ در جرعہ صہبا نشکست تشنگیم ہے۔ نہ مژدۂ دیدارے کہ دل بر نشاط آں گل بستی، و نہ کرشمہ سخنے کہ لب بہ زمزمہ آں تواں کشودن ...... امید کہ ازیں بعد زود زود بہ ارمغانی غزل شادم فرمایند، و نوید در و کیو تاہی ہجران روز فراق کہ اندریں موسم کہ خسرو انجم بہ اسد جائے دارد عجب نیست بوستہ ندو دولت و اقبال روز افزوں باد۔"

جواب نامہ شیخ امیر اللہ مرحوم تخلص "دیدن دلنواز نامہ دل را ز نو مسند شارخ آرزو را بیوند ساخت۔ گر از نارسیدن پاسخ نامہ ہائے شیخ مکینہ و راز خدا شدم مدارید۔ من خود از جانب شما گمانی داشتم کہ کجا یید و چہ در سر دارید بارے پردہ از روے کار شما بر گرفتم۔ و دانستم کہ کیمند مرا فراموش کردہ بودید۔ ناگاہ ورود جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ افتاد، شنیدید کہ غلانی (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زندہ است مہر کہن بجنبید، خواستید کہ بنامہ یاد آورید، از فراموشی روزگار گذشتہ اندیشہ کردید، ناچار دروغے چند بہم بافتید و آں را پیرایہ دیباچہ نامہ ساختید۔ از حال من پرسیدہ آید۔ چہ گویم کہ بگفتن نیرزد، چنانکہ گفتہ اند:

شکستہ دل تر ازاں ساغر بلورینم کہ در میانۂ خارا کسی زدورش!

خیرہ سر و آشفتہ واے، نہ زبان سخن سراے و نہ دل از سراسیمگی بہ جاے۔ چہار سال میگذرد کہ مقدمۂ من باجلاس کونسل در پیش است، و دلم از تفرقہ بیم و امید ریش۔ تلخی کہ قطع خصومت توانہ کرد بہ بنیادہ رو ہنگام بہ پایاں رسیدن تیرہ شب امید ورنیامدہ حالیا ساں سرم کہ چوں جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈش بنٹنک بہادر بدیں دیار سرآید بہ اتفاق در آوردن دادخواہم، و اندعاے سد و حکم اخیر تسلم گردو۔ بے آنند کہ نواب عالی جناب بہ دہلی نخواہد آمد و ہم از آں رہگذر راہ بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنین ست بدا من روزگار من، و آوخ از دوری راہ و درازی کار من۔

خواستہ آید کہ نتائج طبع والاے شما بگرمی را نتواں دیدہ ہائے کام و زبان خود بشمار ارمغانی فرستم فرصت آں کجا بود، ماجرایں کہ آمد آمد نواب گورنر، و عدیدۂ اخبار از ہر در، ترتیب افراد مقدمہ و تمہید نگارش حال، سنجیدن اندیشہ ہائے دشوار رنگ و سگالیدن اندازہ بیان آں ما بہ دستیاری و غمخواری از کسے چشم ندارم کہ چوں وقتے انشا کردہ یافتم نقل آں توانہ برداشت، یا چوں دفترے از ہر رنگ چند روز دگر معاف دارید تا ازینکہ بمن بپیوندید گاہ گاہ بہ نامہ رنگ زداے آئینۂ درد و داد باشید۔"

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور یگانہ دوست ہیں۔ ان کو نواب امین الدین خاں مرحوم کے باب میں جبکہ وہ رئیس فیروز پور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں:۔

"مخدوم غالب! اگر نہ اندوہ سترگ بند بر دم نہادہ بودے من دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و روزگار پر عربدہ ہا بنیاد کردمے مرزا شما (یعنی سوغشا)

ورناکامی من ست (جس کے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) وگرنہ اگر تاب و تواں داشتے آں قدر با شما داد و نجے کہ شما را از من دگر پیاں بزیاں رفتے، و مرا سر درو تنگے۔ آخر از خدا بترسید و از رو داد بسنجید کہ کار من و شما بداں رسید کہ روز ہا گذرد و بہ نامہ یاد نگردم۔ گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بند گذارش اندوہ تازہ ام بشکوہ کجا بہ طرز نا شناوی رسد اگرچہ اندریں ورق گنجائی ایں دو سطر نیز نہ بود۔ لیکن اندیشہ بداں پیچید کہ مبادا دوست ادا نشناس من مرا از خود خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زبان زدۂ جاوید و گسستہ امید باشم۔

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعائے اصل بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب شفیق نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ را ہماں موج بلا کہ من ازو آتم شکستہ بود (یعنی تعدی رئیس فیروزپور) تو نہ بسیلاب فنا داد خون وفایم بگردن کہ دریں سفر از ہمپائیش باز ماندم۔ درماندگی و بیچارگی من از ینجا تواں سنجید کہ دنداں بر جگر نہم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تنہا گذارم۔ اگر قاضی محبت بدیں جرم بر نطع نشاند، و بہ تیغ بیدریغ خونم ریزد، سزا وارم۔ و لطف دریں ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار آیم و ہنگامہ پرسش آرایم، شرمساری بیش گردد و خجلت افزاید۔ مگر سراج الدین احمد خاں بہ تلافی برخیزد تا از گرانی بشکوہ (شرمندگی) سبکدوش گردم و گرد خجلت از چہرہ بر افشانم۔ یعنی کمر بہ غمخواری در مہر نوازی استوار ببندید، و خود با دوست دیرینہ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و سگالش گری بجا آرید کہ ایں دردمند و راز خاناں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ رو سیاہ را فراموش کند، و شما را بجائی او داند۔ و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد شما را دریابد۔ و داند کہ اسد اللہ پیش ازو بہ کلکتہ رسیدہ است قطع نظر ایں مدارج کہ برشمردم۔ آخر خدائے ہست و وداے ہست۔ افسانۂ ناکامی و ستم کشی ایں فرو ماندۂ ناامید سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند۔"

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں "گوہر آگین نامۂ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، و دیدۂ و دل را فروغ و فراغ بخشید۔ تا رسیدن نامہ مرا با فسردگی شوقم گل گردید۔ چرا برگ گل نہ کردید۔ تا از اداشناسی ہائے شما خورسند بودے و شما را اہل دل و دانشور شمردے۔ من و ایمان من کہ ہمیشہ مہر شما بہ مغز دل و دیدہ و محبت شما با جان در آویختہ تا زندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئین من ست و مودت دین من ست اگر در نگارش نامہ درنگے رود و بہر بر فراموشی محمول نہ شود دردہا در دل، و ہنگامہا در نظر، و تفرقہا در خاطر، و سوداہا در سر۔ چہ گویم چہ می کنم و روز و شب بچگونہ بسر می برم"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرلنگ صاحب فارن سیکرٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں۔ "عمر من و جان من! پس از رسیدن گرامی نامہ در بند آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماجرائے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ روز شنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارم اخلاق را شیرازۂ وجود از ہم گسیخت، شمع ایوان سروری مرد و نہال باغ آگہی را برگ و بار فرو ریخت۔ دستگیر درماندگاں را دست از کار رفت، و گرہ کشائی بستہ کاراں را ناخن شکست نہ کم بہ ہیچ بچگونہ گویم؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ بقید اند؟ کہ مستر اندرو استرلنگ مرد۔ و از گیتی جز نام نیک با خود نبرد۔ کاش روئے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بروز نگوشم ریختندے تا شنودے کہ چہ شد۔ اکنوں امید غمخواری از کہ باید داشت؟ و دل را بخیال گردش چشم کرگسیں داد۔ رپورٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر در خصوص داد خواہی من بہ صدر فرستادہ است۔ چہ گویم کہ چہ مایہ امیدگاہ و اندوہ فزائے بودہ است۔ تکیہ بر کار سازی آں چابک خرام بادیۂ فنا (یعنی استرلنگ) داشتم اکنوں ازیں شش سو فلک بکام دشمن ست زینہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ روی داد، و آں گلبن روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، پس از وے سر انجام دفتر کہ چہ شد و جایش کہ گرفت۔ اللہ بس ما سوی ہوس۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں۔ "والا نامہ رسید، و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید چہ، بہ سنگین دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت دوست انشا می کنم و اجزائے وجود از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بہر دست راہ گرداند، و ناقہ بسر منزل دیگر راند گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت، چرا بحال خرد سالاں خود نپرداخت۔ و سایہ از سر شان باز گرفت۔ وائے بے یاری یاران وے و دریغا بے پدری پسران وے۔ ہر چند از مرگ نتواں نالید۔ و گسستن تار و پود پندار ہستی را چارہ نتواں کرد۔ لیکن انصاف بالائے طاعت ست، ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نبود۔ چرا آں قدر صبر نکرد کہ بکلکتہ رسیدے۔ و دو روئے نظر بہ فرزند دگر بارہ دیدے چہ آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے۔ و کار با ساختہ دانش وے روان گشتے، حیف کہ ہمیں پسرش خرد سال ست و باشد کہ بحقیقت سرمایۂ پدر، دانا دیگر و آوردن زرہائے پراگندہ توانا نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد بباد دہد و بہ زود دوستان خود ستم کشد۔ کہیں برادران ناکام گزار و ہر آئینہ دریں حال، بے مایہ ہوشمند و حق شناس، جز بہ سایۂ آید و غمخواری بے پدر ماندگان نماید بندہ و در من قال

مرا باشد از درد طفلاں خبر کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمار آں بیچارگاں عین فرض و فرض عین ست ہم بر شما ہم بہ مرزا ابو القاسم خاں بیکسی ایں جماعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔"

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں۔ "زینہار صد زینہار اے مولوی سراج الدین! بترس از خدائے جہاں آفریں کہ چوں قیامت قائم گردد و آفریدگار بنشیند، من گریہ و مویہ کناں در آں ہنگامہ آیم، و در تو آویزم، و گویم کہ ایں آں کس است کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت، و دلم برد، و چوں من از سادگی بروے تکیہ کردم و ایں را از دوستاں برگزیدم۔ نقش مہر باخت و بمن بیوفائی کرد خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ وائے بر من کہ روزگارہا گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداش وفاست بسم اللہ ہر قدر تواں بیفزائے کہ ایں جا مہر و وفا فراواں است۔ لاجرم جفا نیز باید کرد کہ فراواں باشد و اگر خود ایں تغافل بے پاداش افزاہ۔ یعنی (بپاداش) جرمے دیگر ست نخست گناہ مرا خاطر نشاں باید کرد۔ وانگاہ انتقام باید کشید تا شکوہ در میاں نہ گنجد و مرا زہرۂ گفتار نباشد۔ منم کہ معاش من از گوناگوں رنج و رنگ رنگ عذاب بجاد کعز ماند خون در جگر، و آتش در دل و خار در پیرہن و خاک بر سر ہیچ کافر ہمیں روزگار گرفتار

مبارکباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد راست بہ تنہا روی ماتم کہ در صحرا پایش بگل فرو رود. و ہر چند خواہد کہ بالا جہد نتواند فرو تر رود. والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر کہ گیتی را بہ بیش دیدہ، رو خانش راز ندگی دل نشستے بلکہ رنگ آشد. دیگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بہ بیداد کہ شادماں دارم و ماندگی من او بیچارہ ایں سنجید کہ نتوانستم ہمپا بیش کردن و دو او اشتم و او را تنہا گذاشتن۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمے کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔ "کار من بدارگاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشید، تباہی گزید. حالیا بران سرم کہ اگر مرگ اماں دہد باز بداں در العیتی در سپریم گورنمنٹ رسم و در دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغان ہوا و ماہیان دریا. ابر خود بگریانم. ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفرلق از روے دفتر سرکار ثبت شدہ بود بایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش رانندے و گفتندے کہ برزہ مخروش، آنچہ تو یافت و المعودہ یافتی ازاں افزوں تر نیست اوقتہ او داد نیز ہماں ست لاجرم دیوانہ بودمے اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک قبیل (یعنی باجمعے کثیر) کہ خویشاں دیداوداں می اند، بہ ستیزہ برخاستے و بہ باطل ستیزی نام بر آوردمے۔

چہ کنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت خدا را بنگر و بدرد دل من وا رس کولبرگ بتوسط کرنیل ہنری الاک برمن مہرباں شود، و رپوٹے کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید. بصدر فرستد و جوابے کہ سود مندتر ازاں نتواں سنجید. از صدر حاصل نماید، ہنوز آں جواب در راہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد. و ہاکنس کہ بجاے کولبرگ نشنید. انچہ بہ ہم زدن ہنگامہ سعئے دالبی باشد. از بہر من بعدد لولیند. و من دواں داوری (معاملہ) از مسٹر استرلنگ چشم باوری داشتہ باشم ہنوز آں رپوٹ بصدر نرسیدہ باشد کہ مسٹر استرلنگ رہرو راہ عدم گردیدہ باشد. چوں از ہمہ گسلم دید امن جارج سوئنٹین بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغل جہاں بانی افشاند. سبحان اللہ! معزول نگردد مگر کولبرگ بمرگ ناگاہ نمیرد مگر استرلنگ. بولایت نرود مگر جارج سوئنٹین، در غور ایں صدمہ ہائے جانکاہ نباشد مگر اسد اللہ داد خواہ ...“

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط "دلنواز نامہ پس از عمر رسید دمے دیگر بخشید، تا عمر باندہ سپری شدہ را بہ تلافی تواند کرد. ا تا شاد کردن دلے کہ بہ حادثہ بہ غم سپردہ باشند نہ آساں ست. منم کہ چوں نامہ شمار سیدے متانہ از جاے برجستے، و جہاں جہاں نشاط اندوختے ایک تا چشم بر سواد ایں صحیفہ دو چار شد گیتی در نظرم تیرہ و تار شد نخست انچہ بنظر در آمد خود آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خون کرد. یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما. ہے ہے! مخدوم مرحومہ ہماں است کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنودہ بودیم دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپائے خاطر را فرو گرفتہ و رنظر دارم کہ از مرگ بر شما چہ قیامت گزشتہ باشد. توانا ایزد پاک شمارا شکیب عطا فرماید و تو مندی دل و توفیق ثبات ارزانی داراد و ایں سانحہ در روزنامہ عمر شما خاتمہ مکارہ و مقطع مصائب گرداند.

آشکارا کہ مخدوم مرا از علاقہ تازہ خوشنودی نیست. ہر آئینہ انکشاف ایں معنی غبار ملال بر دل فرو ریخت. خدا را دل تنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت. شاد شانے (معمورہ) بدیں تازگی در گیتی کجاست خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر. من خدا کہ اگر متاہل نہ بودمے، و طوق ماتمی حیال بگردن نداشتمے، دامن بوہر چہ ہست افشاندمے و خود را وراں بقعہ رساندمے تازیستے دراں مینو کدہ بودمے، واز زریخ ہوا. ہاے ناخوش آسودمے. نہ بہوا ہاے سرد. و خوشا آبہائے گوار و فرخا بادہ ہائے ناب، وحبذا ثمرہاے بہشتی رس.

ہمہ گر میوہ فردوس بخوانت باشد غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعہ کا قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا ہے وہ انہوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندری میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا تو اس کا شکریہ ادا اور ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے۔ "نامہ را نامورہ ساختن و ہیچ را ہمہ پنداشتن عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ. خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روئے نماید، و آں بزرگ مرحمت بے استدعاے سائل بظہور آید. نگرندہ اگر دیدہ حق بیں دارد، بنگرد کہ واجب تعالی شانہ ما جزاے ممکنہ را کہ در کتم عدم متواری بودہ اند، بمحض عنایت پیرایہ وجود بخشیدہ، و براں معدومات منت نہادہ حقا کہ اگر نامہ لبسر اکردہ شود رقم نشتن قطعہ تاریخ در آئینہ سکندر را ازیں عالم خبری دہد چوں ناخواستہ ایں چنیں نوازش بمیان آمد. ہر آئینہ روائی خواہش را چگونہ چشم نتواں داشت لاجرم در گزارش مدعا فضلے بیان نمادہ آز ور سرانجام گفتگو دادہ می شود.

نہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر و المعی یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ وعلاقہ وارہانید. حقا کہ اگر از پایہ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں پایہ بکار ہند کہ از صد یک دامانند، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی سنجیدہ. ہنوز ایں عہدہ دوں مرتبہ تری خواہد بود. بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خان (رئیس جھجر) پانصد روپیہ ماہانہ براے مصارف خدام مخدومی معین کرد نزد خود خواند. روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت، ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر مولانا را نا بپدرود کند. سوے خود طلبید و دوشالہ ملبوس خاص بدوش وے نہاد، و آب در دیدہ گردانید، فرمود کہ ہر گاہ شمای گوئید کہ من رخصت می شوم. مرا جز اینکہ بپذیرم، گریز نیست. اما ایزد لا تاد اند کہ لفظ وداع از دل بہ زبان نمی رسد. الا یصدح تکیلی." تا اینجا سخن ولیعہد بہادر ست. غالب ستہام از شمامی خواہد کہ واقعہ تودیع مولوی فضل حق وانمود ہنا کی ولیعہد بہادر ہمہ در آمدن و لہائے اہل شہر بعبارتے روشن دیلنے دلاویز در آئینہ سکندر بقالب طبع در آید و مراد دیں لتقدمنت پذیر انگارید۔ والسلام ”

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں کہ جس سے ان کے مفصل حالات معلوم ہوں۔ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

ہر نفسے کز کوے تو بہ نگم گذرد یادم از دولہ سحر سکتا زدہد

رسیدن مہر افزا نامہ دل برد و جاں بخشید. اگر چہ آں جان با من نماند، دم برہمالی

نامہ بہ فشاندن رفت، لیکن سپاس دلربائی و جان بخشی باقی ست امید کہ تا جان بخشیدۂ یزداں در تن ست گزاردہ آید۔

مخدوم من در رسیدن نامۂ پیشین دودل (متردد) چراست؟ ہنوزم نشاط درود آں نمیقہ در دل، و سواد سطور آں صحیفہ در نظر جا دارد چوں فرمان چناں بود (یعنی در نامہ پیشیں) کہ غالب خویشتن نشناس. لختے از رسم و راہ ستر گان پارس برگوید، و کتابے ازاں گروہ نشاں دہد کہ راز آں دیرین کیش، و ساز ایں باستانی زباں، ازاں اوراق تواں یافت جرم دانش من (علم من) اندازہ سر انجام پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد) چوں دوبارہ گفتند کہ خواہش چنیں ست ناچار مہر خاموشی از دہان و پردۂ شرم نادانی از میاں برداشتہ میگویم کہ روائی ایں خواہش از ہیچکس چشم نتواں داشت. خود را بہ بند ایں پژوہش (تلاش) خستہ نتواں کرد"۔

نگارندۂ داستان مذاہب بایں ہمہ لاف آشنا روئی (واقفیت)، آنچہ میگوید نہ ہمہ است ودرنہ ہمہ بہ جائے خود ست (یعنی نہ مکمل ست و نہ سراپا صحیح ست)۔ پارسیانیکہ در سورت و بمبئی آشیاں دارند. زنہار گماں نبری کہ ازاں گروہ (یعنی از ستر گان پارس) جز نام ونشاں دارند. آں پویۂ وآں ہنجار (یعنی آں روش وآں طریق) وآں نگارش وآں گفتار ندانند، وجز تخمہ و نژاد از رہ و شیوہ بپارسیاں نمانند پارسیاں از گرامایگان روزگار و برگزیدگان دادار بودہ اند، و بہ روزگار فرماں روائی خویش دانشہائے سودمند (علوم مفیدہ) و کنشہائے خرد پسند (اخلاق پسندیدہ) داشتند، کشائش راز خواہش ہفت سپہر و نمائش ماہ و مہر، پدید آوردن رخشندہ گہرا از تہ خاک، و بر کشیدن بادۂ ناب از رگ تاک، پژوہش اسباب خستگی و رنجوری وگزارش احکام پزشکی (طبابت) وچارہ گری، پردہ کشائی فہرست اسرار کیانی (سلطنت) وفرماندہی ورصد بندی کتقدیم آثار بندگی و فرمانبری، عنوان بیکدگر بستن و نگ رنگ گہرہا و ہنجار سرہ کردن گوناگوں ہنرہا دارد. گیاہا فراخور بہر درد بکار اندر آوردن، وپرندگان درشت را بہ شکار اندر آوردن کوتاہی سخن والائی اندازہر گونہ بینش، و پیدائی اندازۂ کمال آفرینش، ہمہ درآئینۂ اندیشۂ ایں فرزانگاں روی نمودہ و انگیزش بایستگی گفتار وکردار کہ اکنوں بہ اندکے ازاں لیبار تازند. از مغز دانش ایں فرہنگیاں بودہ است. گنجینۂ خسروان پارس را از ہر علم دفترے بود، دہر دفتر از گراں مایگی گنج گوہرے. چوں دولت ازاں طائفہ روی برتافت، و سکندر ابن فیلقوس بر ایران دست یافت. کتب خاص خسروی بتاراج رفت، و آنچہ پراگندہ بود دگمنامان بہر گوشہ وکنار داشتند بہ جاماند. تا بہ روزگار پیرمندی تازیاں دراں کشش و کوشش از ہر جا گرد آمدہ فراہم آمد، و بہ فرمان خلیفہ افروزیندہ گلخن گرمابہائے (حمام ہائے) بغداد شد. ہمانا احکام آذر پرستی ہم. بہ آذر بازگشت. زبان آوران عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازہ برانگیختند. اکنوں کیست تا بداں زبان کہن سخن درست تواند گفت، واز اں دیریں آئین براستی خبر تواند داد. پژوہندۂ ازیں راز را کام دل بر نیاید، و من ہمانا کہ ہر چہ پس از فراواں جستجو فراہم آوردہ آنچناں باشد کہ دل بداں تواں نہاد.

دیگر آنچہ کلک گہربار بداں رفتہ کہ منتہے از گفتار نارواے خود بر نگارم و لختے از ماجرائے خود بر گزارم. اندیشہ را سبب گزیدن و خرد را انگشت زار و (در محل تعجب) افگند.

پچگریم از دل بیجائے کہ در پہلوے من ست ‖ ستم رسیدہ یکے ناامیدوار یکے

از آنچہ بداں ارزم ومرا ایں پایہ از کجا باشد کہ ستودگان مرا ستایند و گفتار مرا ودّہ گرہ شعرا جادو ہند از فرجام فرہمندی ہستی (یعنی از شان وشکوہ ہستی) در سرو برگ پیدائی. بہ کرزہ آشکارا بیناں. زود زداں دبوالالابد یکتا گزینان (یعنی قائلان وحدت وجود) نمود بے بود ست. انچہ من دادہ اند زبانے ست یافہ سرائے و خامہ ایست بیہودہ پوے. من ہم از بے مزگی چوں کودکاں کہ درم از سفال سازند بہ گنجینہ داری نازند سرودۂ زبان وبیہودۂ خامہ (یعنی کلام خود را) پارہ پارہ بہم بستہ در ریزہ ریزہ وگیہ جا کردہ بگمان نام آوری کہ دل از تاب اندوہ نارسائی آں خون ست. دیوانے ترتیب دادہ جا بجا بنظرگاہ التفات یاران فرستادہ ام بزرگوارے کہ بہ پرسش غالب متوجہ آمدہ. سواد ہر غزلے کہ خواہند ازاں اوراق بر دارند وگرا انتخاب و التقاط اشعار حوالہ براے نامہ گرد آورد (یعنی مرتب تذکرہ) است نہ باشارہ وایمائے نخود اما اگر گزارش حال نخود جو س ست، خود ایں مایہ بس است کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند. سخن را در ستائش من بدیں گونہ پرکس نشانند کہ از ناکساں روزگار و بیکسان دہلی دیار مسلمان زادہ است کافر ماجرا و گبری ست مسلماں نما کہ از غلط نمائی غالب تخلص می کند و بدیں رنگ ذاتم می نماید.

خرسندی غالب نبود غنچہ گفتن ‖ یک بار بلغزائے کہ اے ہیچکس ما

پنہاں نماناد کہ در اصل آفرینش از دودۂ روز فروز رفنگاں، و حلقۂ بخت برگشتگاں ستم رسیدۂ وردے ہی نادیدہ کسم آرائش سخن پیش کش (یعنی بر طرف) ترک نژادم، ونسب من با فراسیاب و پشنگ می پیوندد بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیان پیوند ہم گوہری داشتند، ولیعہد دولت ایشاں رایت سروری و سپہبدی افراشتند بعد سپری شدن روزگار جاہ مندی آں گروہ (یعنی سلجوقیان) چوں ناروائی (کساد بازاری) و بینوائی روے آورد چیسے را ذوق رہزنی خانگری از جاے برد و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت. نیاگان مرا بہ توران زمیں، شہر سمرقند، آرامگاہ شد ازاں میانہ نیائے من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد، و بہ لاہور بہمراہی معین الملک گزید چوں بساط دولت معین الملک در نوشتند، بدہلی آمد، و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست. زاں پس پدرم عبداللہ بیگ خاں بہ شاہجہان آباد بوجود آمد، و من بہ اکبرآباد. چوں پنج سال از عمر من گذشت. پدر از سرم سایہ برگرفت عم من نصراللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد. ناگاہ مرگش فراز آمد کہ بیش پنج سال پس از گذشتن برادر بے بیں بار در برداشت مرا دریں خرابہ جا تنہا گذاشت وایں حادثہ کہ مرا انشانۂ جاں گدازی دگر دوں را آگینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی بہنگام ہنگامہ لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر بروئے کار آمد چوں عم مرحوم از دو ہوایان دولت اہل فرنگ و با انبوہی چار صد سوار برکاب صمصام الدولہ با سرکشان سرگرم جنگ بود، وہم از بخشش ہائے سرکار انگریزی دو پرگنہ پر حاصل از مضافات اکبرآباد بہ جاگیر داشت. سپہ سالار سرکار انگلشیہ بہ خوں بہائے آفتاب (یعنی نصراللہ بیگ خاں) کلبۂ تار گدایاں را چراغ، و ما بینوایاں را بعوض جاگیر بمشاہرہ از خار خار جستجوئے وجہ معاش فراغ بخشید تا امروز کہ شمارۂ نقش شمار زندگانی بہ چل و چاری رسد. بداں مایہ خرسندم، و بداں مایہ قانع در سخن از پوئی یافتگان سہ ابر فیاضم، و سواد معنی را بفروغ گوہر خویش روشن کردہ ام. از نسیم

آفریدہ حق آموزگاریم بگرداں، و بار منت رہنمایم بہ دوش نیست۔

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم ! زاں رو بصفائی دم تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

"نامہ بپایاں رسید، و شرم پراگندہ گوئی و دور از نفس سخن برآشفتم کرد و دیدہ وراں دانند کہ گفتنی فراواں بود و افسانہ پریشاں تا کجا اندک گفتے، و گفتہ را از درازی نگاہ داشتے۔ مراد و آنچہ رفت گناہے نیست و اگر خود گناہ است دوست کریم است و کرم عذر خواہ۔ والسلام!"

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے اپ رائے چھجمل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتہ میں تھے ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوئے ہیں لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اس کی جبلت میں ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں: "اینکہ گفتی فلانی روش حکیمانہ دارد و دنیا را کار آگاہانہ می گذارد۔ با ایں ہمہ اندوہناکی خندہ ام درگرفت و عنان ضبط خویش از کفم بدر رفت۔ خدائی کہ بر اسپاں باد در رفتار بر نشستن و گرد ہا گرد مردم را پیشا پیش دوانیدن، تن را بلباس رنگا رنگ بر آراستن و معدہ را بہ الوان خوردنیہا ممتلی گردانیدن شہوہ از اندازہ بروں راندن، و غبار معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید و پرہیزگاراں را نشاید کار دانشوراں چیست؟ دور از آبادی در بن کوہے نشستن و از شش جہت در بروے خلائق بستن۔ تن را بہ ریاضت فرسودن و جاں را بہ تجردی پالودن۔ ہر کہ حکیم خرد گزین ست کار وے بارش ازین ست۔ بے برگ و نوا ستادہ شکنجۂ گوناگوں حسرت بد دجتہ بہ فراغ اے سرخوشی (مستی) رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رو بالطبع کریم بود۔ ہنوز آرمیدنی از ریاح خلیفۂ عالم کہ بہ ممتلی دادی ہر آئینہ لغزان باد ست روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسہ زد ذات او و رحمت ذرہ قلعت کردہ زاری کناں ایں کہ فلاں و بہماں را از منو نوشتن راندہ است۔ حقا کہ وے در مصلحتے نداشت و ہر چہ کرد از بے خردی و ابلہی کرد۔ چہ۔ اگر دانا بودے و خود داشتے آناں را کہ راندہ است نہ راندے و کارہا از آناں گرفتے وایناں را کہ با خود در یک پیرہن جا دادہ است۔ چوں غبار از دامن افشاندے، و ہرگز بہ ہوائے ایناں نرفتے کہ دیکا حلی و دزید، ہم در ایام صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں دلے پرداشت، و با ایناں لختے رام بود۔ از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن و در دام ایناں بدیں کوری در آمدن، نہ بفرمان دانش ست نہ بفرمان بینش۔ حکیم کرامیگوئی و کرم پیشہ گرامی خوانی؟... چوں سخن دریں باب بیاد ست نامہ بہ دعا ختم می کنم دیدہ را بینش درست و دل را دانش سود مند روزی باد"۔

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ جنسے مرزا الہ آباد سے مل کر کلکتے روانہ ہوئے ہیں۔ کلکتے میں پہنچ کر ان کو سفر کی تمام روداد لکھی ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں "روز سہ شنبہ چارم شعبان پارۂ از روز بر آمدہ در کلکتہ رسید۔ بعزیب نوازہ مہابے دو باب بے منت را نازم کہ درچنیں دیار خانۂ چنانکہ باید و ہر گونہ آسائش را بکار آید، ہم در ابانداز فراغ خاطر آزادگان فضائے و ہم اندرونماندہ ان از دنیا طلباں بیت الخلائے، و در گوشۂ صحن پر از آب شیریں چاہے۔ و بر طرف بام در خور اہل تنعم آرامگاہے بے آنکہ جستجوے رود، یا گفتگوے شود بے منت و بے زحمت کرایہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید، و آدم و چارپا را تکیہ گاہ آرامش گوید و روز از رنج راہ آسودہ نشود لامع النور (یعنی مفاوش نامہ مولوی محمد علی خاں)

را شغل راہ مدعا ساختم و در کشتی نشستہ آہنگ ہگلی بندر کردم۔ لطف ملاقات نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد روا است، و اگر گویم کہ مرا بہ من برنمک آورد و نیز ہم روا دور بخدائیکہ خرد آفریدہ و خرد در برگزیدہ جزیں نائیگی و صاحبدلی در بنگالہ دیگرے نخواہد بود۔ یارب ایں گوہر گرامی از کدام کان ست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامی دودماں۔ یا سے چوں نخستیں صحبت بود۔ بچارہ جوئی و مصلحت پرسی در و سر ندادم، و در سہ ساعت نشستہ بکلکمدہ باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روزہا نواب را با حکام ہگلی در خصوص زمینے کہ وقف امام باڑہ است معارضہ در پیش و دل سرگرم فکر کار خویش ست۔ واللہ در القائل"۔

ہمہ را ماتمی حسرت دنیا دیدم چوں بعشرت کدہ گبر و مسلماں رفتم
روزگار دفتر ما برد بجنت فرماں پذیر باد"

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں:۔ "از لواز و حالات اینکہ سخنوراں و نکتہ رساں ایں بقعہ پس از ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند و در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یکشنبہ نخستیں سخنگویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے و غزلہاے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از مرات بسعادت رسیدہ است دراں انجمن می رسد، و اشعار مرا شنودہ بیانگ بلند می ستاید۔ و بر کلام نادرہ گویان ایں قلمرو تبسم ہاے زیر لبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذات مفتون خود نمائی ست، ہمگناں حسد می برند، و کلانتران انجمن و فرزانگان فن بر دو بیت من اعتراض نادرست برآوردہ آنرا شہرت می دہند بے آنکہ مرا زباں بپاسخ آشنا شود۔ از دانشوراں، کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از آنانند جوابہای یابند۔ وایں زلوئے خوشی می نشینند۔ چنانچہ ہم بہ فرمان ایں دو بزرگوار مثنوے انشا کردہ ام۔ و بعد از اظہار عجز و انکسار خویش جوابہاے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ وآں مثنوی (یعنی مثنوی باد مخالف) پسندیدۂ طبع عالمے افتادہ است۔ انشاءاللہ العظیم زیں بعد عریضیکہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے ازاں ابیات در نورد آں خواہد بود۔"

نواب ضیاء الدین احمد خاں اکبر آباد گئے ہوئے ہیں۔ مرزا ان کو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کو یاد میں دل سے اس طرح لکھتے ہیں۔

"جان برادر! اشک وآہ غالب نامراد لیے آب و ہوائے اکبر آباد بہ شما سازگار باد۔ گرفتم کہ ورود البسیر گرفتہ (یعنی فرض کردہ آید) در نزدیک خور یعنی بدانست خود از من دور تر رفتہ آید، اما چوں ہنوز مرد وطنیہ ہماناکہ نزدیک با منید شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل مرا دریں سفر باشما فرستادہ تا ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) داد شادمانی دیدار وطن نیز توانم داد۔ زنہار اکبر آباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت) ننگرند، واز رہگذر ہاے آں دیار الحینا گوئی واللالال سرای، گذرند کہ آں آباد چہ ویران و آں ویرانہ آباد بازیگاہ بچوسن مجنونی، و ہنوز آں بقعہ دادو ہر کف خاک چشمہ خونی ست۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمیں جز مہر گیا (تام رنگی) نہ رستے، و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ) بہ تماشا دیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے) کہ رنداں را ہواے صبوحی از سر و پارسیاں را نیست نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرہ خاک آں

گل زمیں را از تن پیامے بود دلنشیں، و ہر برگ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، اما تازگی وقت شمار او در نظر داشتہ در دو پردہ شور پرسش برانگیختہ بود، و چشم براہ داشت کہ کسے نویسند او دریغ کہ ہیچگاہ ننوشتند کہ رخش نگین (یعنی اسپ سنگین کہ در اکبرآباد معروف است) دعاے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا بہا شیخ سلام کن بہ زبان موج چہ گفت؟"

میر مہدی کے نام ۔

سید! خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہاں کو سر پر اٹھایا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر پھاسہ نکلا ہے۔ تم کو سرمایۂ آہ آتش گفتار بہم پہنچا ہے۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی! یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے میں باقی ہیں۔ آریخ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے!

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے۔ اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی ــــ اور کیسی بڑی خوشی ــــ دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے۔ کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی۔ وہی القاب قدیم۔ کتاب کی تعریف۔ عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی خدا تم کو یہاں لائے گا۔ تو اس کی زیارت کرنا۔ پنسن (پنشن) کے ملنے کا حکم آج کل میں آیا چاہتا ہے۔ اور یہ توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔

میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا۔

(۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

بھائی!

ایک خط تمہارا پہلے پہنچا، اور ایک خط تمہارا کل آیا۔ پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اگرچہ کل کے خط میں بھی صرف کتابوں کی رسید تھی۔ لیکن چوں کہ دو امر لکھنے کے لائق تھے اس واسطے ایک لفافہ تمہاری پسند کا تمہاری نذر کرنا پڑا۔ پہلا امر یہ کہ آج میر نصیر الدین دوپہر کو میرے پاس آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تم نے بھی خط لکھا تھا کہ میر سرفراز حسین الور گئے۔ اور میر نصیر الدین بھی کہتے تھے۔ کہ میں اور وہ ایک دن پانی پت سے چلے۔ وہ ادھر گئے۔ اور میں ادھر آیا۔ ظاہرا پارسل کے پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب رہ گئی۔ اب ان تک کیوں کر پہنچے گی؟ خدا ظاہر کرے!

میاں لڑکے! سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد عظیم صاحب کے۔ وہ خلیفہ تھے۔ مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ اس واسطے میر نصیر الدین کو پہلے بندگی لکھتا ہوں اور پھر تمہارے علاقے سے ان کو دعا لکھتا ہوں

صوفی صافی ہوں۔ اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ جواب ہے تمہارے اس سوال کا کہ جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا اب کی خط میں تم نے میرن صاحب کی خیر و عافیت کیوں نہ لکھی؟ یہ بات اچھی نہیں۔ میں تو ڈر گیا۔ کہ اگر تمہارے خط میں ان کو دعا سلام لکھوں گا۔ تو ان سے تم کاہے کو کہوگے؟

پیرزادے صاحب یعنی میر نصیر الدین نے ان کی بندگی مجھ سے کہی ہے واسطے خدا کے میری دعا ان کو کہہ دینا۔

(۴ر جولائی ۱۸۵۹ء)

برخوردار! نورچشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی! تم نے بخار کیوں آنے دیا؟ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا۔ جو تم مانع نہ آئے؟ کیا تپ ابن بنگر آئی تھی؟ جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔ حکیم اشرف علی ابھی گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ یہ خط بھی آج روانہ ہوتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمہارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے۔ اور تمہاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔ سنو میاں سرفراز حسین! ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا، وہ بھی اس طرح کہ جیسے جلال اسیر کہتا ہے۔

بعینہ در شکر اب است و رو بیادارو!

پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ لوہ خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب! سرنامہ میرے نام کا۔ آغازِ تحریر میں القاب میرا۔ پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا ــــ یہ کیا سیر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے۔ اور میرن صاحب کا نام اور ان کے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا۔ تو میں اس کا جواب تمھوں سے لکھوں گا۔

اور ہاں میاں! پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا؟ کہ ہم نے سنا ہے کہ بچاے اس کا مرنا سنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا مجھ کو معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری۔ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے۔ تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے۔ اب میں کس کا نام لے کر روؤں۔ اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔ توضیح بقید نام لکھو۔

(۳ ــ ۱۸۵۹ء)

میری جان ! سنو داستان !

صاحب کمشنر بہادر دہلی. یعنی سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا. پنج شنبہ ۲۴ر فروری کو میں گیا. صاحب شکار کو سوار ہو گئے ہیں میں الٹا پھر آیا. جمعہ ۲۵ر فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی ملی۔ بعد پرسش مزاج سے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا. کہ یہ خط ہے. مکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا. تمہارے باب میں لکھتے. کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو. سو ہم تم سے پوچھتے ہیں. کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی. ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا. وہ پڑھوا دیا پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی. کہا ایک مکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے. اور ایک ہم کو دو. میں نے عرض کیا. کل حاضر کروں گا. پھر پنسن کا حال پوچھا. وہ گزارش کیا. اپنے گھر آیا اور خوش آیا.

دیکھو میر مہدی! حاکم پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر! کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بہ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے. یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے. ہرمن کر دوسرے دن یک شنبہ یوم تعطیل تھا. میں اپنے گھر رہا. دو شنبہ ۲۸، فروری کو گیا. باہر کے کمرہ میں بیٹھ کر اطلاع کروائی. کہا اچھا توقف کرو. بعد تھوڑی دیر کے گڑھ کپتان کی چٹھی آئی. سواری مانگی۔ جب سواری آگئی. باہر نکلے. میں نے کہا. وہ کتابیں حاضر ہیں کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ— وہ ادھر سوار ہو گئے. میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا. سہ شنبہ یکم مارچ کو ہو گیا. بہت انبساط اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے. کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا. وہ دکھائے ایک خط مکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا. وہ دے کر یہ التماس کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے. بہت اچھا کہہ کر رکھ لیا. پھر مجھ سے کہا. کہ ہم نے تمہاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر کو کچھ لکھا ہے. تم ان سے ملو. عرض کیا بہتر اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا. گئے ہوئے تھے. کل وہ آئے. آج میں نے ان کو خط لکھا ہے. جیسا کہ وہ حکم دیں گے ان کے موافق عمل کروں گا. جب بلائیں گے تب جاؤں گا. دیکھو سید! اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا. بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا نہ رہنے دیا. پھر بس لگے ہے. وہ آج سلطنت کا دھندہ ہے. میرے تعقد کا حکم بھجوایا. حکام سے مجھ کو عزت دلوائی. میرے صبر و ثبات کی داد ملی. صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا. میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟

میر سرفراز حسین کو یہ خط پڑھا دینا. اور ان کو اور نصیر الدین حاجی کو اور میرن صاحب کو دعا کہنا.

(۴ر مارچ ۱۸۵۹ء)

میاں کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو؟

کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے. یہاں ان کی سسرال میں تھے کیا کیا نہ ہوئے. ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے. خوش دامن صاحب بلائیں لیتی ہیں. سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں. بی بی مانند صورت دیوار چپ. جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ. وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہوتی. ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی. امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا. گیارہ روپے خرچ راہ دیئے. مگر ایسا جانتا ہوں. کہ میرن صاحب اپنے عہد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے. اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے. اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا یہی ہوگا. کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے. اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے. اور وہ محل غور ہے. اس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے. اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے. اور قلاقند تمہاری نذر کر کے تم پر احسان دھریں گے.

بھائی! میں دلی سے آیا ہوں. قلاقند تمہارے واسطے لایا ہوں. زنہار دیکھیو. مال مفت سمجھ کر لے لیجیو. کون گیا ہے؟ کون لایا ہے. کلو. ایاز کے سر پر قرآن رکھو. کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو. بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں. کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا. واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا اور سنو. مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک ان کے پہنچانے کو گئے. رسم مشایعت عمل میں آئی. اب کہو بھائی کون برا ہے. اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے. یہ لوگ قران پر اپنی جان نثار کرتے ہیں. عورتیں صدقے جاتی ہیں. مرد پیار کرتے ہیں.

مجتہد العصر سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا حضرت ہم تم کو دعا کہیں، اور تم ہم کو دعا دو. میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ ——

طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے. خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام. یہی ہے مذہب حق. والسلام والاکرام —— مل علی کہا اور فارغ البال رہا کر.

(۳ر جون ۱۸۶۱ء)

واہ۔ وا سید صاحب !

تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے. نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے. کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں. مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے. آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے. مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں؛ جو سخن پردازی کروں؟ ——

بھائی! تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو. اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو. کیا قتیل، کیا رود نیل یہ سب تمہی کی باتیں ہیں.

لو سنو۔ اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا؛ اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماران کے دروازے کے پاس کی کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم۔ خاص و عام ـــ کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکموں کو کام کچھ نہیں تاج علی مرزا قیصر مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل یہ کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گئی۔ دیکھیے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں؟ خلق نے از روے قیاس، جیسا کہ دل کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑادی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ر دسمبر کی ہے، اب شنبے کو بڑا دن اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین! تم کیا کر رہے ہو؟ اور کس خیال میں ہو؟ اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دیدار!

میرن صاحب کہاں ہیں! کوئی جاتے اور لاتے۔ حضرت! آئیے، سلام علیکم مزاج مبارک کیسے! مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا ہو تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ یہ منشی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں کیا کروں؟ میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ تم کیسے بے ادبیاں کر سکتے۔ انشاءاللہ خدا جب ایک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیونکر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے! اللہ! اللہ! اللہ!

(بدھ ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

میاں!

کیوں تعجب کرتے ہو۔ یوسف مرزا کے خطوط نہ آنے سے؟ وہ وہاں بھی طرح ہے، حاکموں کے ہاں آنا جانا، نوکری کی تلاش۔

حسین مرزا صاحب بھی وہیں ہیں؟ وہاں کے حکام سے بحالیٔ پنشن کی درخواست کر رہے ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کے ہر مہینے میں ایک دو خط مجھ کو آتے ہیں، میں جواب بھیجتا ہوں۔

بھائی! لکھنو میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن و امان ہوگا۔ نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ اُمرا و شرفا کی حکام سے ملاقاتیں بقدر توقیر تعظیم و توقیر پنشن کی تقسیم علی العموم۔ آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

اور ایک نقل سنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ محلے میں ہندو بھرے ہیں، اہل اسلام نہیں۔ ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا۔ اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دلی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنو کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہی صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے۔

"ٹکٹ آبادی مندرون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ"

مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار کا ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دو شنبے سے دیکھیے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔

یہ کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا حال سنو۔ بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کا حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خان پنشن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ، کوتوالی چبوترے جائیں گے۔ اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا۔ اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ترحم ہوں گا۔ چھ مہینے کا یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا۔

میرن صاحب جو بلائے گئے ہیں۔ اس طلب کے جواب میں یہی کیوں نہیں لکھتے۔ کہ ٹکٹ میرے نام کا حاصل کر کے بھیج دو۔ تو میں آؤں۔ دیکھو اب دس پانچ دن میں سب حال کھلا جاتا ہے۔ میر سرفراز حسین کو دعا اور میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔ میرن صاحب کو مبارک باد کہنا۔

(یکم مارچ ۱۸۵۹ء)۔

کیوں یار کیا کہتے ہو! ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمہارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا ہے

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

کلو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جائیے گا نہیں۔ میں آتا ہوں۔ بھلا بھائی اچھی حکمت کی۔ کیا وہ میرے بابا کے نوکر تھے؟ کہ میں ان کو بلاتا؟ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلیف نہ کریں، میں حاضر ہوتا ہوں۔ دو گھڑی کے بعد وہ آئے ـــ ادھر کی بات، اُدھر کی بات، کوئی انگریزی کا کاغذ دکھایا، کوئی فارسی خط پڑھایا۔ اجی کیوں حضرت! آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے! صاحب میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا ان کو پتہ لکھ ہے کہ وہاں ٹھہر کر مجھ کو اطلاع کرو۔ میں شہر میں بلالوں گا۔ صاحب! اب وہ ضرور آئیں گے۔ آخرکار ان سے اجازت لے کر اب تم کو لکھتا ہوں۔ کہ ان سے مکرر یہ کلمہ کہہ دو کہ بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو۔ یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ ۲۱،

طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آئندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟ میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا اور شفیع احمد صاحب کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا۔ میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ یہ خط پڑھ کر ادھر کو روانہ کر دو۔

کیا خوب بات یاد آئی، کیوں وہ شہر سے باہر ٹھہریں؟ اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، 'کرانچی' میں، 'چو پہیے' میں یعنی ڈاک میں آئیں، بلّی ماروں کے محلے میں میرے مکان پر اتر پڑیں۔ میرزا باقر علی بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں۔ میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیرات علی کی حویلی درمیان میں ہے۔ ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔ یہ صلاح تو ایسی ہے کہ اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو ابھی عید یہیں کریں۔

(۳؍ مئی ۱۸۵۹ء)

برخوردار کامگار میر مہدی!

قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ مچ میرا حلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے لیے لکھا، ارادہ تھا کہ خط میں لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ چلو دادا جان کھانا تیار ہے ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھ رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیا لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا کر سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، گھر میں چلا گیا۔ اور ہاں ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں، میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو وہی ہوا۔ تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ تو اب بتاؤ خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ کیا لکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کے سن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر ہے۔ یہاں کے حاکم نے ایک روبکاری لکھ کر، اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی۔ میرا اس میں کیا مقدور؟

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ وہ ایک آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا، باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا، منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں، میں پلنگ پر لیٹا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اس کے سر پر ٹوکرا، اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا۔ آہاہا! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔ فیضِ خاص نہیں لطفِ عام ہے۔ شراب نہیں، آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سر بمہر گلاس سمجھا، کیوڑے سے بھرا ہوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی (۸۰) تھے، پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے۔ تا ان کی برائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا۔ بھائی! یہ کیا کم ہے؟ مگر میں تمہاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمہارے پاس روپیہ کہاں ہے جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد و دولت زیادہ۔

لکھو ایک انگریزی ________ شراب ہوتی ہے، قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے، ہاں ذخیرۂ سرور میں ہو تو ہو۔ مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی لکھ دو، ان کے علم کی کنجی ہیں اور سکے ٹکے کی کتابیں چالیس روپے کو لے گئے ہیں۔ میری دعا کہہ دینا۔

(۶۱، جولائی ۱۸۵۹ء)

میری جان! خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے!

بوڑھا ہونے کو آیا۔ داڑھی میں بال سفید آ گئے مگر بات سمجھنی نہ آئی۔ پنسن کے باب میں کیسے ہو اور کیا بے جا الجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بہ طریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تو اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعے سے اس کو کچھ نسبت ہے؟ نہیں یہ حضرت کا سوال امیر خسروؒ کی انمل ہے۔

''چیل لبھولا لے گئی تو کاہے سے پھیکوں راب''

علی بخش خان پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینوں کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسین خان سو روپے مہینے کا پنسن دار، بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لعل ڈیڑھ سو روپے، بائیس مہینے کے تینتیس سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ اس طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آئندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔

مجھ کو پھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ "سائل کو بہ طریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔" میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر، اجرٹن صاحب بہادر بہ طریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت و واپسی کریں گے۔ تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی نئی صورت عمل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

(۳؍ فروری ۱۸۵۹ء)

سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار، تم مجبور میں ناچار!

لو اب تم کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خان بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی جائیداد اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بمجرد اس خبر کے استماع کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ یاد نہیں۔ مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج جمعہ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھوں۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پہ حکم ہے کہ دریافت کرو۔ کون بے ٹکٹ مقیم ہے۔ اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ ——

"اسد اللہ خان پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا۔ نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل براون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے"

پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دیا۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و دکان کیوں بناتے ہیں! جو مکان بن چکے ہیں۔ انہیں ڈھادو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔— اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے— آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے۔ جو رہتے ہیں۔ وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نور چشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو وہ چاہیں قبول کریں۔

(فروری ۱۸۵۹ء)

میر مہدی! جیتے رہو!

آفرین! صد ہزار آفرین! اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔

سنو! دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پتی۔ انصاریوں کے محلے کا، رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے!

میری پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کماحقہ سمجھ لو۔

"والرجحان الالطاف خفیۃ" ایک طرز خاص پہ تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلانے شخص کے پنشن کے کل چڑھے ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل فوراً بہ طرز مناسب ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا۔

اور ہاں! صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیہ خزانے سے منگوا لو۔— میں نے کہا۔

"صاحب! یہ کیسی بات ہوئی کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو؟" فرمایا کہ تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا۔— اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔— آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ بہرحال ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے۔ مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے کہ یہ دو حاکم۔ یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب یہی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دے دی۔ اب دیکھو حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزہ ملا۔ تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب، میر نصیر الدین کو دعا۔

(دوشنبہ، ۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے، اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال۔ جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر

ہنس بول لیتے تھے :۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک!
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یہ شعر میر درد کا ہے۔ کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ بھو صاحب! اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو۔ اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو کیا لکھتا ہوں۔

سنو! پنشن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال معلوم نہیں۔

دیر آید درست آید۔

بھئی! میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت۔ بلکہ اس طرح سے لکھا گیا ہے۔ کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ”ہے ہے۔ کیا غضب ہوا! یہ کیوں اچھے ہو گئے؟“ یہ باتیں تمہاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں۔

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں
دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یوں ہے۔

میر کو کیوں نہ مغتنم جانوں
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

میر کی جگہ میرن اور رہا کی جگہ بچا۔ کیا اچھا تصرف ہے! اے میاں! تم نے کچھ اور بھی سنا۔ کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ نصیر خان عرف نواب جان بدالدان کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی ہے؟ — یوسف مرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی! اب تم چاہو بیٹھے رہو۔ چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خان یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خان جس کا روز مرہ ہے۔ کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔

(۳ر اپریل ۱۸۵۹ء)

خوبی دین و دنیا روزی باد!

میر اشرف علی نے تمہارا خط دیا۔ وہ جو تم نے لکھا تھا۔ کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا۔ صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو۔ جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا۔ نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ ہم تخلص بہم پہنچایا۔ فقط۔

پنشن کی صورت یہ ہے کہ کرنل سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کا دن ساتویں اگست کی مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں۔ یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے۔

غلام فخر الدین خاں کی دو ایک روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے۔ خدا چاہے تو بحال ہو جائے۔

صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا۔ اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا۔ کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تاکہ میں اس سے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔

ہاں صاحب میر اشرف علی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ میر سرفراز حسین نی پت آیا چاہتے ہیں۔ اگر آ جائیں تو مجھ کو اطلاع کرنا۔

(۸ر اگست ۱۸۵۸ء)

سید صاحب!

تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی ہے جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا۔ تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو روپے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے؟ سبحان اللہ! باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے۔ آبرو بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو۔ تو کہوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہر حال اتنا سنا ہے۔ اور دلائل و قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں۔ اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم۔ نہ کسی کو خبر۔

میاں! کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آئے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ — منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو گھر میرے لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمے لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بقول منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا

شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمالِ خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے اس پچاس جلد میں سے شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی! میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے۔ اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔

امین الدین خان کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے اگر ختم کر کے مسودہ ان کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟

اہلِ خطہ کا حال از روئے تفصیل مجھ کو کیوں کر معلوم ہو۔ سنتا ہوں کہ دعوائے خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا ہے۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ بلیک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گورنمنٹی نہ ہوتے۔ قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ مردہ از جورِ پا چہ نالی
در کیش روزگاراں گل خوں بہا ندارد

خیر جو ہونا ہے۔ ہو رہے گا۔ بعد وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم ناحق کیوں دل جلا رہے ہو؟

(اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"میری جان! وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروج تھی۔ اس میں خُر بہ خائے مضموم نورِ قاہر کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے ـــ اسی واسطے آفتاب کو خُر لکھا۔ شید کا لفظ بڑھا دیا۔ شید بہ شین مکسورہ و یائے معروف بروزن عید روشنی کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ اُس نورِ قاہر ایزدی کی روشنی ہے۔ خُر اور شید یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھہرے۔ جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہا۔ کہ وہ منبع علوم ہوئے۔ واسطے دفع التباس کے خُر میں واو معدولہ بڑھا کر خور لکھنا شروع کیا۔ ہر آئینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا۔ اور منظور کیا اور فی الحقیقت یہ قاعدہ بہت مستحسن ہے۔ فقیر جہاں خُر بے اضافۂ لفظ شید لکھتا ہے موافق قانون عقلائے عرب بہ واو معدولہ لکھتا ہے۔ یعنی خور اور جہاں بہ اضافۂ لفظ شید لکھتا ہے۔ وہاں بہ پیروی بزرگان پارسی سرِ لفظ خور کو بے واو لکھتا ہے۔ یعنی خرشید خُر کا قافیہ ذرہ اور برہ کے ساتھ جائز اور روا ہے۔

خور میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا۔ وہاں میں بے واو کیوں لکھوں؟ رہا خورشید؟ چاہو بے واو لکھو۔ چاہو مع الواو کو غلط نہیں جانتا اور خُر کو کبھی بے واو نہ لکھوں گا۔ قافیہ ہو یا نہ ہو۔ یعنی نظم میں وسط شعر میں آپڑے یا نثر کی عبارت میں واقع ہو۔ خور لکھوں گا۔

یہ بات بھی تم کو معلوم رہے کہ جس طرح خُر ترجمہ قاہر کا ہے۔ اسی طرح جم ترجمہ قادر کا ہے۔ کہ بہ اضافۂ لفظ شید۔ اسم شہنشاہ وقت قرار پایا ہے۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ سچ کہیے۔ ہمیں وہاں کوئی مجتہد العصر نہ کہتا ہو گا؟ نہ کہو۔ تم کو کیا؟ میں نے کہا۔ تم نے مان لیا۔ اب کوئی کہے یا نہ کہے۔ میاں بدر الدین سے ایک مہر کھدوا دوں گا۔

"جناب مجتہد العصر سرفراز حسین"

بس تم یہ مہر خطوں پر۔ محضروں پر۔ تمسکوں پر کرنی شروع کرنا۔ سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنے لگیں گے۔

حکیم میر اشرف علی کو اور ان کے فرزند کو دعا پہنچے۔ میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن! اب وہ خس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں جھجھر پر لپیٹتا ہوں۔ دم بدم بھگوتا ہوں۔ وہ لو کہاں جو پردے سے لپٹ کر ہوا صاف کو گئے۔ اور پانی کو ٹھنڈا کرے۔ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو۔ اب کہاں؟ شراب پندرہ دن کی اور باقی ہے۔ آئندہ خدا رزاق ہے۔

(۲ر جولائی ۱۸۶۱ء)

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں۔ جو دعا لکھوں؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو۔ کاغذ کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔

یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دعا۔ اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔

کیوں سچ کہو۔ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟

ہائے! کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو۔ وہ خط ہی نہیں ہے چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے۔ نخلِ بے میوہ کہ ہے۔ خانۂ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ تو زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اور اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے۔ تو بھائی! ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے؟ ـــ اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ لکھنی تھی۔ اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو خفا نہ ہو۔

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے۔ پھر نہ آئے۔ نثر فارسی نئی میں نے کہاں لکھی کہ تمہارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں؟ نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں سے ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی کلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج اس نے غسلِ صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینہ بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ۔ نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے۔ نہ آہنی سڑک آتی ہے۔ نہ کہیں دمدمہ بنتا

ہے۔ دلّی شہر شہرِ خموشاں ہے۔ کاغذ نبڑ گیا ورنہ تمہارے دل کی خوشی کے واسطے اور لکھتا ابھی۔

(یک شنبہ ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۱ء)

سید صاحب!

کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں گے۔ حال سفر کا جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لو گے۔ میں کیا لکھوں؟ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انہیں سے سنا ہے۔ ان کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے۔ لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا۔ کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپے کی ناحق زیرباری ہوئی۔ چونکہ یہ زیرباری میرے بھروسہ پر ہوئی تو مجھے شرم ساری ہوئی۔ میں نے اس چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس قسم کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں۔ ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیرباری سے دل کڑھتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں کر نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس پہلے فرمایا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں، ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا، سمجھ لیا جائے گا۔

"کلیاتِ اردو" کا چھاپہ تمام ہوا۔ اغلب کہ اسی ہفتے میں غایۃً اس مہینے میں ایک نسخہ بہ سبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔

کلیاتِ نظمِ فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا۔ تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا۔ تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا۔ مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے۔ "واللہ علیٰ کل شئی قدیر۔"

خدا کا بندہ ہوں۔ علی کا غلام۔ میرا خدا کریم۔ میرا خداوند سخی۔

"علی دارم چہ غم دارم"

وبا کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ پانچ سات دن بڑا شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا لڑکا ہیضہ کر کے مر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور میں بھی دبا ہے۔

الگزنڈر ہیڈرلے مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ، وہ دولج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس ایام میں ماخوذ ہو کر مرا؟ خیر! یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

(جمعہ ۱۰، محرم ۷۸ھ ۲۶ر جولائی ۱۸۶۱ء)

جانِ غالب!

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا۔ کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں۔ تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے۔ کئی بار۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار دورہ میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں۔ سید صاحب نہیں آئے۔ تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے۔ اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں۔ جتنی گرد اڑی۔ اس کو آپ نے ازراہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ بہرحال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں۔ اور میرن صاحب میرے پاسِ الفت پر خبر پائیں۔

(چہار شنبہ ۶ر جون ۱۸۶۰ء)

جانِ غالب!

تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔

"ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے؟
مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہو گیا؟
اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی۔
"میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے؟"

ارے! اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں۔ یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی، پروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت دشت بدلی ہوئی ہے۔ بہرحال می گذرد۔

مصیبتِ عظیم یہ ہے۔ کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر! کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جائیں۔ تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب

ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی۔ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد! ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہیڈرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔"

(۷، جون ۱۸۶۱ء)

بھائی!

کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں، اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کلکٹر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے۔ تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے اہالی لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین لوگ باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں۔ سلطان جی میں مولوی صدر الدین۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جان نثار کے پھاٹک کی سڑک۔ خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ۔ چلے جاؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔"

(مرقومہ صبح جمعہ ۱۸ جمادی الاول ۲، دسمبر سال حال ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء)

میاں! کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمہارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟

خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم تو زنجیر کی عادت رکھتے ہو۔ عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟

در بیر بال بال بچ گیا۔ جو اس کے خلاف کہے۔ اس کو غلط جانتا ہوں۔ میں نے خط تمہیں جان کر نہیں لکھا۔ تم نے لکھا تھا کہ بعد عید میں وہاں آؤں گا

مجھ کو خط لکھنے میں تامل ہوا۔ لکھتے کچھ ہو۔ کرتے کچھ ہو؟

تنخواہ کی سنو!

تین برس کے روپے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے۔ سو روپے خرچ کے جو پائے تھے۔ وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو عملہ [illegible] کی نذر ہوئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سود مول۔ سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے۔ میں کہتا ہوں۔ یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھے دے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو۔ پان سو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو۔ تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں۔ جب تک جیوں گا۔ ایسا ہی رہوں گا۔ میرا اور دیگر سے بچنا معجزۂ اسد اللّٰہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللّٰہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے۔ کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور پھر دلوائے؟

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں۔ اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جو اب ترکی ترکی۔ جواب عربی عربی جو انہوں نے لکھا۔ وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں۔ دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھئی! وہ مجتہد ہوں۔ ہوا کریں۔ میرے تو فرزند ہیں۔ میں تو دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو بھی دعا۔

(یکم مئی ۱۸۶۰ء)

میری جان!

تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے۔ اگر خط پہنچا ہے۔ تو جواب۔ ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔

حکیم اشرف علی آئے تھے سر منڈوا ڈالا ہے۔ محققین رو ڈسکم پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو ڈاڑھی رکھو۔ کہنے لگے۔

"دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم"

واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ میر احمد علی صاحب آگئے بحال و برقرار ہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سنی جائے۔ میرا سلام کہنا اور مبارکباد دینا۔ خبردار بھول نہ جائیو!

تمہاری شکایت ہائے بے جا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا۔ اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی۔ میں نے یہ تجویز کر لیا تھا۔ کہ جب کرنال سے خط آئے گا تو میں جواب لکھوں گا آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت ہے۔ ابھی کھانا پکا بھی نہیں تبرید پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا۔ اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار ہے۔ ایاز کو خط دے کر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو۔ تمہارا گلہ بے جا یا

بجا؟ بھائی گلہ کرو، تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی؟ اور ہاں یہ کیا ہے! کہ بہت دن سے نہ ان کی خیر و عافیت نہ ان کی بندگی؟ اگر وہ مجھ سے خفا ہیں۔ تو ان کی بندگی نہ لکھتے خیر و عافیت تو لکھتے؟ یہ باتیں اچھی نہیں۔

میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں۔ تنہا تمہارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ ان کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آ جائیں گے۔ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کے بود و باش کی حقیقت لکھو۔ رہا میرا پنشن۔ اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر ملے گا۔ تو تم کو اطلاع دی جائے گی۔

شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرائے کو مکان ملنے لگے۔ چار سو پان سو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔ آئندہ کیا ہوگا؟ سلطان العلماء مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو اگرچہ نظر ان کے مدارج علم و عمل پر بندگی چاہیئے۔ مگر میں عزیزداری و یگانگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا، اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

(سہ شنبہ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۵۹ء)

واہ حضرت!

کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے۔ کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا۔ میرا بچھونا مجھ کو ملا۔ میرا حمام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور، کوئی آئیو — کوئی آئیو فرد ہو گیا۔ میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔

"اکنوں شب من شب است و روزم روز است"

بھئی تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا۔ اگر پہنچتا تو بے شک وہ تمہاری نظر سے گزرتا۔ اور میرن صاحب اس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ روداد لکھتے۔ جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر جیسا کہ میرا گمان ہے۔ خط نہیں پہنچا۔ تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے، تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب ان سے میرے خط کے جواب کا تقاضہ کیوں نہیں کرتے؟ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں، جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم ان سے خواہشِ وصال کرتے ہوئے ڈرو۔ میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔ نہ صاحب۔ یہ کچھ بات نہیں، میرے خط کا جواب ان سے لکھوا کر بھجوا دو۔ یہاں کا حال وہ ہے۔ جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم، ہوا گرم، تپش مستولی، اناج مہنگا۔ بے چارہ منشی میر احمد حسین کا بھتیجا یعنی میر امداد علی آشوب کا بیٹا۔ محمد میر شب گزشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے، جوان صالح، پرہیزگار، مومنین کا پیش نماز تھا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

مجتہد العصر کا حکم بجا لاؤں گا۔ اور نہ رئیس کو بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر جائے گا۔ اور مدار المہام امر واقعی لکھ بھیجے گا۔

مجتہد العصر کو دعا کہنا۔ اور یہ خط پڑھا دینا۔ میرن صاحب کو دعا دینا اور کہنا کہ بھلا صاحب۔ تم نے ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہم بھی تمہاری طرز کا تتبع کریں گے۔ حکیم محمد اشرف علی کو دعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں ان میں راہ و رسم تعزیت و تہنیت ہو۔ تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی ان کو معلوم ہو۔ کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قبائل تمہارے وہیں ہیں۔ اگر وہاں کچھ رسائی حاصل ہو۔ تو خیر ورنہ یہاں کیوں چلے آؤ۔

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے۔ جو دروازہ تھا وہ گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں۔ قلم دان سب توشے خانے میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا۔ کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں؟ چار پانچ دن سے فرصت ہے۔ مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی۔ کہا۔ کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔

الور کی ناخوشی — راہ کی محنت کشی۔ تپ کی حرارت۔ گرمی کی شرارت یاس کا عالم۔ کثرتِ اندوہ و غم۔ حال کی فکر، مستقبل کا خیال۔ تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال۔ جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں۔ کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔ بارے رفعِ مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے تپ جاتی رہی ہو۔ تندرستی حاصل ہو گئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

ہائے! پیش مصرع مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا۔ خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو پسند آیا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔

ہا ہا ہا۔ میر افضل علی صاحب کہاں ہیں؟ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنو کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھئی میرن صاحب! بھلا ان کو ہماری دعا کہنا۔

(صبح جمعہ ۲۶ر ستمبر ۱۸۶۲ء)

بے مے ز کُند در کفِ من خامہ روانی
سرد است ہوا آتشِ بے دود کجائی

میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں۔ آگ تاپتا جاتا ہوں۔ گرمی میں گرمی نہیں۔ مگر ہائے آتشِ سیال کہاں! کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

میاں تم پنشن پنشن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ ابھی تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنشن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے۔

دیکھیے کیا جواب آتا ہے
بہرحال جو کچھ ہوگا تم کو لکھا جائے گا۔

اجی، وہ یوسفِ ہند نہ سہی، یوسف دہر سہی، یوسف مصر سہی، یوسف کشور سہی، ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خیر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے کہ میں ساڑھے سات روپے مہینا بھیجا جاؤں گا۔ اب ان کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں، خرچ جلد بھیج دو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہرحال میرن صاحب کو یہ عبارت پڑھوا دینا۔ سرفراز حسین کو دعا۔ یوسف ہفت کشور کو دعا۔

(۱۲؍ دسمبر ۱۸۵۹ء)

سید صاحب! اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علیؑ کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال ہے کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں، عاشق زار نہیں۔ بندۂ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں۔ تمہارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں۔ وہ آئیں گے تو یہاں ان کو دوں گا۔ محرم تمام ہو لیا ہے، آج سہ شنبہ ہے حضرت کا پتہ نہیں۔ ظاہرا برسات نے آنے نہ دیا۔ برسات کا نام آ گیا۔ سو پہلے تو مجملاً سنو! ایک غدر کالوں کا۔ ایک ہنگامہ گوروں کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا۔ ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آتی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا، ہزارہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جناب میرن کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

(۲۹؍ جولائی ۱۸۶۲ء)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ "بنیے سے سیانا سو دیوانہ" "صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوۂ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔ جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش میں کرتا ہوں؟ "استغفر اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ" یا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بیچ بیچ کر بکری خریدوں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا۔ بھائی! یہ تو میں نے اپنا، از دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا اس پنشن قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھیے کب آئے؟ آئے تو مجھے دربار میں بلائے یا نہ بلائے! خلعت ملے یا نہ ملے؟ یہ بیچ میں اک اور پیچ آ پڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر صرف اسی کا انتظار نہیں اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنشن کے ملنے نہ ملنے کا تردد بدستور رہے گا۔ یک سیر کیونکر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنشن جاری ہونے پر بھی تو سوا رام پور کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور صرفہ جاؤں، تین برس ثبات قدم اختیار کیا۔ اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت جیسا مناسب ہوتا ہے ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب! میرن صاحب نے دو سطریں دستخط خاص سے لکھی تھیں۔ واللہ میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمے کا ذکر ہے۔

(یکم نومبر ۱۸۵۹ء)

؎ دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور! تم کو پہلے یہ خط لکھا جاتا ہے۔ کہ میرے دوست قدیم میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو معلوم بھی نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر اپنی زبان سے پڑھ دینا۔

؎ شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب
اے تو غائب نہ نظر، مہر تو ایمان منست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن

کے بعد دوسرا خط پہنچا۔

سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ فقط بطرف شعر و سخن کے تمہاری شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے۔ اور جناب جو تمہاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے۔ تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

شعر

؎ زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

؎ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے۔ اس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس ــــــــــ بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو؟ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۱۸۵۸ء)
(منشی ہرگوپال تفتہ کے نام)

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کے آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

"علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علیؑ کو صحیح جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اسی کے اجارے میں آئی ہے۔ یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہو لے۔ اپنے کو بیگانہ یک دگر سمجھیں؟ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں اگر کہیں! سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے۔ خدا کرے کہ وہ خط جس میں، آپ کو میں نے سلام لکھا تھا۔ آپ کی نظر سے گزر گیا ہو یانا۔ اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجیے گا۔

ہائے میجر جان جاکوب! کیا جوان مارا گیا ہے! بہ سچ اس کا یہ شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو سانح آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ نواز! یہ بھی انہیں میں سے ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں؟ اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں اور مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ! چشم بد دور! اردو کی راہ کے تو سالک ہو۔ گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی پایۂ خوبی میں کم نہیں: مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے۔ سلف پاؤ گے۔ میرا تو بہ قول طالب آملی اب یہ حال ہے۔

؎ لب از گفتن، چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے (خط) مجھ کو لکھا ہے تو کیوں کر مجھ کو اپنے خط کے جواب کی تمنا ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سنا تھا کہ آپ کہیں کے صدر امین ہیں۔ پھر آپ اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامے میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی؟

راجہ بلوان سنگھ کا حال بھی لکھنا ضرور ہے کہ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپیہ مہینہ جو ان کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟ ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔

پتہ مسکن مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ معلوم نہیں ہوا۔ ظاہرا اسی قدر کافی ہوگا ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔ مرزا تفتہ کو دعا کہیے گا۔ اور ان کے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا۔ جس میں آپ کے خط کی انہوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام (جولائی ۱۸۵۸ء)

بندہ پرور!

"آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت آمیز باتوں نے غم بے کسی بھلا دیا۔ کہاں دھیان لڑا ہے۔ کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے۔ آفرین! صد ہزار آفرین! تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے۔"

نامہ خود سال خویش داد نشاں

مرزا تفتہ کا خط ہاتھرس سے آیا۔ ان کے لڑکے بالے اچھے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ آئے کہ آئے ہیں۔ اگر تمہیں بغیر ان کے آرام نہیں تو ان کو بغیر تمہارے چین کہاں؟

صاحب بندہ! اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ لکھا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک

آقا کے غلام ہیں، تم جو مجھ سے محبت کرو گے یا میری غم گساری میں محنت کرو گے۔ کیا تم کو عزیز جانوں جو تمہارا احسان مانوں، تم سراپا مہر و وفا ہو۔ واللہ اسم بامسمیٰ ہو۔

مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے۔ اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے صحت الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی۔ سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ ان کو لکھ بھیجا ہے۔ اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔

حضرت! چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ! اللہ! کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر۔ بہرحال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ اب چھ جلدوں کی کچھ تزئین و آرائش کی جائے۔ آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبد اللطیف اور منشی شیو نرائن، یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور یہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جاوے کہ کیا کیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ چار جلدیں چھ روپے میں اور دو جلدیں چھ روپے میں تیار ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ یارب آرائش کی گنجائش کہاں! ناچار چار کتابوں کی جلد ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کی اور دو کتابوں کی جلد تین تین روپے کی بنائی جائے۔ قصہ مختصر کچھ کیا جائے یا یہی کہہ دیا جائے کہ تیری رائے کونسل میں مقبول اور صرف جلدوں کی تیاری منظور ہوئی۔ بارہ روپے بھیج دے۔

مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بہ زبانِ قلم باہم دگر ہم کلام ہوئے۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام

(ستمبر ۱۸۵۸ء)

مرا بہ سادہ دلی ہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کل دوشنبہ کا دن ۲۰ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک تمہارا اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں۔ وہ نہیں پہنچا۔ کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ لگانے لگا۔ بکس میں سے وہ تمہارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو۔ بعد چاہنے عفو جرم کے آپ کے کل کے خط کا جواب لکھتا ہوں۔

سبحان اللہ! جلدوں کی آرائش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے میرے دل میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ حسب دلخواہ ہو جائیں گی۔ ابرا مہرہ اگر ہو جائے گا تو حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں بھی رہے۔ بارہ روپے کی ہنڈوی پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھ کو اطلاع دیجیے گا۔ ورنہ میں متشوش رہوں گا۔

حضرت یہاں دو خبریں مشہور ہیں۔ ان کی میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں۔ آگرے میں اشتہار جاری ہو گیا ہے۔ اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ ہے کہ کلکتے کے چیف سکریٹر، اکبر آباد کے لفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں۔ خدا کرے سچ ہوں اور سچ ہونا ان کا آپ کے لکھنے پر منحصر ہے۔

اس خط کو میں لکھ کر بند کر چکا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ میرے مشفق منشی شیو نرائن صاحب کا خط لایا۔ بارے قصیدے کا مسودہ پہنچ گیا اور منشی صاحب نے اس کا چھاپنا قبول کیا۔ یہ تشویش بھی رفع ہو گئی۔ اب ان سے میرا سلام کہیئے گا۔ اور یہ ان کو اطلاع دیجیے گا کہ اخبار کا لفافہ ہرگز مجھ کو نہ پہنچا۔ ورنہ کیا امکان کہ میں اس کی رسید نہ لکھتا۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام

(۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء)

مرزا اسد اللہ خان غالب کے سوانح، حالاتِ زندگی، ان کی اردو اور فارسی نثر، ان کے دیباچے، تقریظیں، فارسی میں ان کی غزل کے نمونے اور ان پر اعنتق و مختلف نقادانِ اردو ادب کے حوالوں سے پیش کیے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ایسے خطوط منتخب کر کے درج کیے گئے جن سے غدر کے دوران اور بعد کے زمانے کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے اور اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھتا ہے کہ مرزا غالب کا خود جنگ آزادی کے بارے میں کیا رویّہ تھا۔

حج کے بارے میں ملک کے معروف ادیب
جناب ممتاز مفتی کا ایک خوبصورت
سفرنامہ

لبیک
(دو حصوں میں)

روشن کتابوں میں شائع ہو گیا ہے!

آج ہی

اپنے قریبی بکسٹال / ہاکر سے طلب فرمائیں!
قیمت حصہ اوّل ۳/۵۰ روپے
قیمت حصہ دوم - ۴/۵۰ روپے

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور